قائداعظم محمد علی جناحؒ

بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان



سردار محمد چوہدری

ابتدائیہ

قلم کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز اور کاری ہو سکتی ہے، اگر یہ قلم کسی صاحبِ دل کے ہاتھ میں ہو۔ سابق انسپکٹر جنرل پولیس سردار محمد چوہدری کی زیرِ نظر کتاب میں یہی کاٹ دکھائی دیتی ہے۔ وہ کوئی معمولی قلمکار نہیں، نہ نہ صرف تین دہائیوں پر پھیلے ہوئے مفاداتی حکمرانی کے مکروہ کھیل کے چشم دید گواہ ہیں بلکہ ایک ایسے قلم کے مالک ہیں جس کی نوک کو قائداعظمؒ کے زندہ و روشن افکار نے تراشا ہے۔

بابائے قوم نے پاکستان کی بنیادیں غیر متزلزل جمہوریت و حریت اور ہمہ گیر سماجی فلاح کے حیات بخش رہنما اسلامی اصولوں پر رکھی تھیں۔ ان بنیادوں پر ہمارے کئی آمریت پسند حکمرانوں نے پے در پے وار کیئے ہیں اور بے پناہ صلاحتیں رکھنے والی قوم کو ستاروں پر کمندیں نہیں ڈالنے دیں۔ اس دکھ بھری داستان کو چوہدری صاحب نے بڑی دلسوزی سے بیان کیا ہے۔ قاری واقعات و حادثات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایسے گذرتے ہوئے دیکھتا ہے گویا کہ وہ خود ان کا حصہ ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں قائداعظمؒ کی با اصول اور تیز نگاہ شخصیت اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ امریکی مورخ سٹینلے والپرٹ قائداعظمؒ کے

کردار سے اتنا متاثر ہے کہ وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "جناح آف پاکستان" کی ابتداء ہی ان الفاظ سے کرتا ہے:

"بہت کم شخصیات تاریخ کے دھارے کو قابل ذکر انداز سے موڑتی ہیں۔ اس سے بھی کم وہ افراد ہیں جو دنیا کا نقشہ بدلتےہیں اور ایسا تو شاید ہی کوئی ہو جسے ایک قومی ریاست تخلیق کرنے کا اعزاز حاصل ہو۔ جناحؒ نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔"

قائداعظمؒ کے کردار کے ان تینوں پہلوؤں کو اجاگر کرنیکیلئے قابل مصنف نے قیامِ پاکستان سے پہلے کی پچاس سالہ سیاسی تاریخ کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ پڑھنے والے ایک ہی نشست میں متحدہ ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاسیات کے بنیادی حقائق کا رواں دواں انداز میں ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ اور گاندھی جی اور ہندو لیڈروں کے اصل ارادوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں بالادستی کے یہ وہی پرانے مقاصد ہیں جو موجودہ بھارت کی تمام پالیسیوں کی بنیاد ہیں۔ قائداعظمؒ نے ان ارادوں کو بروقت بھانپا اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمانوں کیلئے پاکستان کی شکل میں ایک پناہ گاہ بنا ڈالی۔

کتاب کا زیادہ تر حصہ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ کے متعین کردہ راستے سے انحراف کی دل خراش داستان پر مشتمل ہے۔ ہماری موجودہ سیاسی، معاشی اور سماجی پریشانیاں اسی روگردانی کا نتیجہ ہیں اور ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہمیں واپس اس راستے پر چلنا ہوگا جس کی نشان دہی بڑے واضح انداز میں قائد نے کر دی تھی۔

سچی باتیں اکثر تلخ ہوتی ہیں۔ کتاب کے بعض مقامات پر یہ تلخی زیادہ نمایاں

نظر آتی ہے۔ ضروری نہیں کہ چوہدری صاحب کی ہر تلخ بات سے اتفاق کیا جائے لیکن انہوں نے کچھ دیکھا اور محسوس کیا، بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ وہ محرم رازِ درونِ میخانہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی موجودہ کتاب مشاہداتی تاریخ نویسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ مقتدر شخصیات کیلئے تازیانہ عبرت، نئی نسلوں کیلئے امید کی کرن، پرانی نسلوں کیلئے ولولہِ تازہ! اندازِ بیاں میں بے ساختگی اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی روانی۔ یہ کتاب ہر شہری کو پڑھنی چاہئے خاص کر ان افراد کو جو اپنی مصروفیات کے سبب ایک ہی نشست میں پاکستان کی غریب و سادہ و رنگین تاریخ سے آگاہ ہونا چاہتے ہوں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے تاریخ ساز انسان کی جغرافیائی تخلیق کی کہانی پڑھنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد
سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی،
سیکرٹری نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن .

دیباچہ

31 دسمبر 1999ء شب نے آخری ہچکی لی تو بیسویں صدر کے ان دم توڑتے لمحات نے مجھیہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس گذری صدی میں انسان نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ میرے ذہن کی سکرین پر بے شمار تصویریں اور تمثیلیں ابھرنا شروع ہوئیں۔ ان تصاویر میں بیسویں صدی کے عظیم سائنسدان تھے تو بڑے بڑے سیاستدان بھی۔ ہوائی جہاز کی ایجاد سے لے کر ای میل اور انٹرنیٹ کی منازل تھیں تو ایٹم بم کی تباہی بھی۔ میڈیکل سائنس کی محیر العقول برکات بھی اپنی موجودگی کا پتہ دے رہی تھیں۔ اسی طرح عظیم جنگوں کی ہولناک بربادیاں تھیں تو بے شمار قوموں کی آزادیاں بھی، انقلاباتِ زمانہ تھے تو اصل کی طرف مراجعت کی اشکال تھی تھیں اور یوں یکے بعد دیگرے بے شمار صورتیں میرے ذہن کی سکرین پر آتیں اور گذر جاتیں۔ ان میں ایک شکل ایسی بھی آئی جو میرے تخیل پر جم کر رہ گئی اور میرے قلب و روں نے بھرپور شہادت دی کہ یہ تصویر سب سے زیادہ حسین ہے، دلکش ہے اور انسانیت کیلئے فلاح ہی فلاح ہے اور وہ پیاری صورت تھی میرے قائد، قائداعظم محمد علی جناحؒ کی۔ یہ سب پر غالب تھی۔ کئی بار ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ شاید میرے جذبات میری خرد پر

غالب آرہے ہیں مگر جوں جوں سوچتا گیا میرے ذہن نے بار بار اور نہایت شد و مد کے ساتھ اسی تصور اور تصویر کی تصدیق کی اور کہا کہ جو کچھ اس شخص نے کیا اور کر دکھایا، وہ کوئی اور شخص بیسوین صدی میں نہیں کر سکا۔ اس نے ایک بکھری بھیڑ کو قوم بنایا، پھر اس قوم کی قوت کے ساتھ ایک نئی مملکت (پاکستان) تخلیق کی اور تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ کر رکھ دیا اور یہ سب کچھ ایک دستوری اور قانونی جدوجہد کے ساتھ حاصل کیا۔ اس صدی کے بلند و بانگ داعی لیڈر مجھے تو اپنے قائد کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ میرے قائد نے تدبر و تدبیر سے کام لیا ور خدا کی ایک بستی (پاکستان) بسا کر دکھادی۔ واقعی وہ شخص عظمتوں کا پیکر تھا اور ہے:

بستی بسانا کھیل نہیں، بستے

بستے بستی بستی ہے

مگر ہم نیاس بستی کو اس طرح نہیں سنبھالا جس طرح ہمارا قائد چاہتا تھا اور ہم نے اس کیبعد ایک دفعہ پھر پستیوں کی راہ اختیار کر لی۔ اسی لئے ہم نے نشانِ منزل بھی کھو دیا اور منزل بھی گم کر دی۔ کیا واپسی کا کوئی راستہ ہے؟

ہاں ہے۔ ضرور ہے اور وہ ہے قائد کا راستہ۔

اب فکر اور سوچ کے حصار نے مجھے اپنا قیدی بنالیا۔ اسی عالم میں جب نے قلم اٹھایا تو تحریر نے اس کتاب کا روپ دھار لیا، جو اب آپ کے سامنے ہے۔

میں قاری کا بے حد ممنون ہوں اور میرا ایمان ہے کہ قاری سے بڑھ کر مصنف کا محتسب اور کوئی نہیں ہوسکتا! اور قاری کے ساتھ احتسابی عمل سے گذر کر ہی مصنف کی تحریر مین اثر اور نکھار آتا ہے اور مصنف کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ ہوتا

ہے۔

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلہ میں مجھے بہت سے دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ سب سے پہلے محمد رفیق ڈوگر صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے طریقے سے مجھے اس تحریر کی طرف راغب کیا۔ میں چوہدری ظہور احمد صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے نہایت محنت سے اسے کمپوز کیا۔ سید اخلاق احمد انسپکٹر پولیس نے اس کی پروف ریڈنگ نہایت انہماک سے کی۔ میں انکی اس کاوش کا مشکور ہوں۔

سردار محمد چوہدری

لاہور،

15 مئی 2000ء۔

مقدمہ

سردار محمد چوہدری نے قائداعظم محمد علی جناحؒ پر یہ کتاب لکھ کر ہمیں ائینہ دکھایا ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آج کل ہر جانب بے یقینی کا دور دورہ چل رہا ہے۔ اور پوری قوم ایک فکری بحران میں مبتلا ہے۔ قائداعظمؒ نے بکھرے ہوئے شیرازے کو کس طرح منظم کیا اور مسلمانوں کو ایک نقطہ نظر پر مرتکز کر کے حصولِ پاکستان کی منزل آسان کردی۔ انہوں نے اس ملک کو کن خطوط پر چلانا چاہا اور علامہ اقبالؒ کے افکار نے کس طرح ہماری شیرازہ بندی کی۔ بظاہر یہ ایک سامنے کی چیز ہے لیکن اس سبق میں سے ہم یہ بھول گئے کہ ان اکابرین نےہمیں کونسا راستہ دکھایا تھا۔ وہ کس طرح کا جمہوری، رفاہی، اسلامی نظام یہاں لانا چاہتے تھے۔ آج کی نسل ان تفصیلات سے آگاہ نہیں۔ چوہدری صاحب نے پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کا جائزہ لیکر ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہم نے اقبالؒ کے افکار سے روگردانی ہی نہیں کی بلکہ قائداعظمؒ کے فرمودات کو بھی پسِ پشت ڈال دیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ ان پچاس برسوں کی مفصل روداد ہے کہ کس کس اہم

اصول کو نظر انداز کیا گیا اور یہ ملک کس طرح اقتصادی طور پر قرضوں کے شکنجے میں جکڑا گیا اور آج اس کی خارجہ پالیسی، آزادیٔ عمل کا کوئی نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پاکستان خارجی اور داخلی طور پر پچاس سال میں آہستہ آہستہ جس نشیب میں اترتا چلا گیا، یہ کتاب اس کی لمحہ بہ لمحہ فکری توانائی سے محرومی کا ایک نوحہ ہے۔ چوہدری سردار محمد ایک دردِ دل رکھنے والے پاکستانی ہیں۔ اگرچہ عمرِ عزیز کا زیادہ حصہ انہوں نے سرکاری ملازمت میں گذارا، لیکن دورانِ سروس بھی وہ پاکستان کے درد سے خالی نہیں رہے۔ ملازمت نے انہیں بصیرت اور آگاہی تو دی، لیکن یہ احساس ان میں ہمیشہ زندہ رہا کہ ہم نے پاکستان کو جن خطوط پر چلانا تھا، ان پر نہیں چلا سکے۔ ان کی یہ کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ پاکستان بنتے ہی کس طرح ہم الاٹمنٹوں اور کلیموں کے چکر میں پڑ گئے اور اس بنیادی فکر کو فراموش کر بیٹھے جس کی طرف ہمیں اپنے عظیم رہنما نے متوجہ کیا تھا۔ اس کتاب میں ہمارے فکری بحران کے کئی پہلو جھلکتے ہیں لیکن دو باتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اور دونوں کا تعلق ہمارے ملک کے سیاسی پہلو کے ساتھ ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم نے قائداعظمؒ کے ان فرمودات کو بھلا دیا جن سے ایک اسلامی جمہوری مملکت کی شیرازہ بندی ہو سکتی تھی۔ غیر جمہوری عوامل نے ہماری سیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ چوہدری صاحب کے ذاتی مشاہدات ان حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایوب خان، یحییٰ خان، بھٹو اور نواز شریف کی حکومتوں نے غیر جمہوری اداروں کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ملکی اور غیر ملکی حکومتوں کے قرضوں نے کس طرح ہماری ملکی معیشت کو ایک خاص راستے پر ڈال دیا، جس سے ہم آج تک چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے۔ ملک میں پے در پے مارشل لاء لگتے رہے، جس سے

جمہوری اداروں کا تسلسل مشکوک ہوتا چلا گیا۔ دوسری طرف ملکی معیشت میں قرضوں کے زہر نے وہ سرطان پیدا کیا کہ ملک آج تک خارجہ پالیسی تو کیا داخلہ پالیسی میں بھی آزاد نہ رہ سکا۔ ان قرضوں کا آغاز ایوب خان کے دور سے ہوتا ہے، جب امریکی امداد ہمیں ملی۔ اس امریکی امداد اور کوریا کی جنگ نے ملک کو خوشحال کیا، جا بجا صنعتیں اور کارخانے لگے، لیکن اس کا ایک نہایت خطرناک پہلو یہ تھا کہ پچاس برس میں پے در پے قرضوں کے نیچے ہم دبتے چلے گئے۔ ہماری خارجہ پالیسی کے علاوہ داخلہ پالیسی بھی اس سے متاثر ہوئی اور یہ عمل دخل اس حد تک ملک پر حاوی ہو گیا کہ کوئی جمہوری حکومت بھی آزادانہ طور پر پنپ نہ سکی۔ جس کسی حاکم نے اپنے آقا سے سرتابی کی، اسے حکومت چھوڑنی پڑی۔ قریبی دور میں بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور خود غلام اسحٰق خان کو اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ لیاقت علیخان اور ضیاء الحق دونوں کو خون کا نذرانہ پیش کرنا پڑا، کیونکہ بالآخر دونوں نے یہ جواء اتار پھینکنے کی کوشش کی تھی۔

قائداعظمؒ کس طرح کا پاکستان چاہتے تھے اور ہم نے پاکستان کو کیسا بنا دیا۔ اس کتاب کا یہ بنیادی موضوع ہے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں ایک ایسی اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں جمہوری قدروں کی نشوونما ہوگی۔ حق و انصاف کی قدروں کا دور دورہ ہوگا۔ یہ اسلامی ریاست بنیادی طور پر ایک رفاہی مملکت ہوگی جس کے باشندے جمہوری اور اسلامی قدروں کے ترجمان ہونگے۔ یہ جمہوریت مغربی جمہوریت سے مختلف ہوگی لیکن جمہوری اصولوں کو اس میں ایک اخلاقی تحفظ عطا کیا جائیگا۔ مزاج کے اعتبار سے یہ ریاست تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں ہوگی۔ بلکہ اسلامی ریاست ہوگی جس میں ہر فرد کو آگے بڑھنے کا پورا موقع ملیگا۔ لیکن

پاکستان بن گیا اور پاکستان بنتے ہی قائداعظمؒ وفات پاگئے۔ پھر انکے مخلص ساتھیوں کو پیچھے دھکیلنے کا عمل شروع ہوا اور نظم ونسق پر وہ لوگ چھا گئے جن کا تخلیقِ پاکستان میں کوئی کردار نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں پورا نظامِ معیشت اور نظامِ سیاست جاگیرداری سانچوں میں ڈھل گیا، پورا نظام طبقاتی نظام بن گیا۔ سیکولر مزاج سرمایہ داروں نے اہمیت حاصل کرلی۔ ملکی فلاح کے مقابلے میں ذاتی آسائشوں نے پورے طبقے کو کھلی چھٹی دیدی۔ جمہوری اداروں کی جگہ فاشی نظام نے لے لی۔ ملکی فائدے کی بجائے ہر حاکم نے اپنے ذاتی مفاد پر نظر رکھی۔ بے دریغ قرضے لئے گئے لیکن ان کا فائدہ عوام کو نہ پہنچا۔ ہم قرضوں اور ان کی قسطوں کی ادائیگی میں اس طرح الجھ گئے کہ پوری معاشرتی زندگی تہ وبالا ہو کر رہ گئی۔ یہ کتاب اس اعتبار سے ایک دردِ دل رکھنے والے آزاد پاکستانی کا نوحہ بھی ہے اور ہمارے لئے درسِ عبرت بھی۔ ایک آزاد پاکستان کی بجائے ہم ایک ایسے غریب پاکستان میں رہتے بستے ہیں، جہاں سیاسی وسماجی ادارے شکست سے دوچار ہیں۔ جہاں ملکی معیشت

> "میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں مروں تو یہ یقین اور اطمینان لیکر مروں کہ مرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناحؒ نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل، میرا اپنا ایمان اور میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناحؒ تم نے واقعی مدافعتِ اسلام کا حق ادا کر دیا۔ تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجالائے۔ مرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں اسلام کے علم کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔"
>
> (قائداعظمؒ محمد علی جناح)

دوسرے ملکوں کی دستِ نگر ہوگئی ہے، جہاں سوچ کے سارے دھارے مفلوج ہو چکے ہیں ۔ اس مرحلے پر قاری کے ذہن میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں ۔ کیا اقبالؒ اور قائداعظمؒ اس طرح کا پاکستان چاہتے تھے؟ کیا ہم نے ملک کو ایک آزاد ملک کے طور پر چلایا یا اسے دوسروں کی اقتصادی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا؟ کیا ہم نے جمہوری اداروں کی نشوونما کی؟ کیا ہم نے ملکی معیشت کو مستحکم کیا؟ کیا پاکستاں کا نصب العین یہی تھا؟

فکری طور پر ہم جس بحران میں مبتلا ہیں، اس میں آج کی نوجوان نسل کو کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ سردار محمد چوہدری نے یہی راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ ہم سے کہاں کہاں اور کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں اور ہم کس کس طرح کے فکری تضاد میں گرفتار ہوئے۔ ہماری سوچ کے دائرے قرضوں اور رشوت نے کس طرح مفلوج کیے۔ پھر ان غیر جمہوری حکمرانوں نے بڑے بڑے ممالک کے سامنے پاکستان کو ایک بے بس اور مفلس ملک کے روپ میں پیش کر کے پاکستان کو انکی مشیت کے حوالے کر دیا۔ رشوت ستانی نے کس طرح ہمیں اپنے شکنجے میں کس لیا۔ آج ہم اس حالت میں پہنچ گئے ہیں کہ اگر کوئی جماعت یا حکمران کوئی آزاد راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اسے ملکی اور غیر ملکی سازشوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال کو پہنچنے میں ہم نے اور ہمارے حاکموں نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ جس کی قیمت ہم آج ادا کر رہے ہیں۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے افکار سے جو روشنی ہمیں مل سکتی تھی، وہ روشنی ہم نے حاصل نہیں کی اور آج ہم فکر ونظر کے اس بحران میں مبتلا ہیں جس سے نکلنے کیلئے بہت زیادہ استقامت اور سلامتی کردار کی ضرورت ہوگی۔ چوہدری صاحب نے ہمیں

آئینہ دکھایا ہے۔ نوجوان نسل جن سیکولر خطوط پر پرورش پا رہی ہے، انہیں بھی بروقت متنبہ کیا گیا ہے اور یہی اس تحریر کا بنیادی مقصد ہے۔ جب تک ہم داخلی اور خارجی پالیسی میں اپنا راستہ نہیں بناتے، جب تک ہم اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے، فکر ونظر کے تضادات برقرار رہیں گے اور اہلِ پاکستان کے بدن کو چاٹتے رہیں گے۔

وحید قریشی

پیش لفظ

آج کل ہر سُو بے یقینی کا دور دورہ ہے اور حالت یہ ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ
آج کہیں ایسی محفل ملتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ساقی جہاں لوگوں کو وہ تلخ شراب میسر
آئے جو ان بیقراروں کے مزاج سے سازگار ہو۔

؎ محفل ندارد، ساقی ندارد تلخے کے ساز دبا
بیقراراں

ہم مایوسی اور بے یقینی میں گھرے ہوئے کسی "خضرِ وقت" کی راہ تک رہے ہیں جو موجودہ کٹھن حالات میں قوم کی رہنمائی کرے۔ اپنے وقت میں علامہ اقبالؒ نے جس "خضرِ وقت" کی نشاندہی کی تھی، وہ قوم کے بطلِ جلیل محمد علی جناحؒ تھے، جنہیں قوم قائداعظم کے نام سے پکارتی ہے۔ جناب سردار محمد چوہدری کا خیال ہے کہ پاکستان کی سیاست میں قائداعظم ل کی شخصیت رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے

اور ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کے سامنے قائداعظمؒ کی سیرت کو کردار کا تذکرہ کرتے رہیں۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے یہ کتاب اسی مقصد کے پیشِ نظر لکھی ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان ''محمد علی جناحؒ'' کا عنوان دیا ہے۔ قائداعظمؒ کی سیاسی جدوجہد کی داستان پہلے ہی حصے میں سمٹ آئی ہے۔ جو کتاب کے ایک تہائی حصے پر مشتمل ہے۔ بقیہ دو تہائی حصہ قائداعظمؒ کی میراث یعنی پاکستان کی پچاس سالہ دردناک تاریخ پر محیط ہے۔ اس کے چند اہم ابواب راہِ منزل سے انحراف، ذلت کی انتہا، صبح کاذب، سب ظلمت، یرغمالی جمہوریت، ان ابواب کا مطالعہ چشم کشا اور عبرت انگیز ہے۔ سردار محمد چوہدری نے اقتدار کی غلام گردشوں میں پاکستان کی تاریخ کو بنتے اور بگڑتے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے انکشافات گہرے غور وخوض کے متقاضی ہیں۔

ضروری نہیں کہ قاری کو مصنف کی ہر بات سے اتفاق ہو لیکن جس بنیادی نکتے پر انہوں نے بار بار زور دیا ہے۔ اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پاکستان کی بقا اور ترقی کا راز اس بات میں ہے کہ اس سرزمین کا نظام ''قوتِ اخوتِ عوام'' پر قائم ہو یعنی کاروبارِ مملکت جمہوری طریقے سے چلایا جائے تاکہ ہر شخص کو یہ احساس ہو کہ وہ ایک آزاد ریاست کا ایک آزاد شہری ہے، جس کی منزل روحانی جمہوریت ہے۔

پچھلے دنوں جناب اشفاق احمد صاحب نے سکول کے بچوں کی ایک محفل میں نظریہ پاکستان کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا تھا کہ باون سال پہلے جب وہ بمبو

کاٹ (یعنی ریہڑے) پر پاکستان کا مفہوم سمجھانے کیلئے گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے تھے تو وہ لوگوں سے صرف ایک ہی بات کہا کرتے تھے کہ پاکستان میں ہر چھوٹے بڑے شخص کو عزت ملے گی۔ یہاں تک کہ جب کسی ملزم کو گرفتار کر کے تھانے لایا جائیگا تو اسے بھی بیٹھنے کیلئے کرسی دی جائیگی۔ لیکن آج میں سخت شرمندہ ہوں کہ میرے وہ تمام وعدے جھوٹ ثابت ہوئے۔ چنانچہ آج حال یہ ہے کہ مظلوم کو کندھا بھی میسر نہیں جس پر سر رکھ کر وہ رو سکے اور اپنے غم کا بوجھ ہلکا کر سکے۔

چند سال پہلے شہزاد احمد شہزاد نے بھی ایک نظم لکھی تھی جس کا ٹیپ کا مصرع تھا:

"بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں

اب تو نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک سابق وزیرِ اعظم کو بھی پابجولاں عدالت میں لایا جاتا ہے۔ ان حالات میں ہر محبِ وطن نوجوان پاکستان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند اور متشکک ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہ نوجوان گوناگوں وسوسوں کا شکار ہو کر پاکستان کے قیام و جواز اور قائداعظمؒ کی جدوجہد کے بارے میں بھی عجیب وغریب سوالات اٹھا رہے ہیں۔ دوسری طرف دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین مصلح کی بجائے مسلح خدائی فوجدار بن کر قائداعظمؒ کو سیکولر ثابت کرنے اور پاکستان قوم کو منافق قرار دینے کا "مقدس" فریضہ انجام دینے میں مشغول ہیں۔ اندریں حالات ضرورت اس بات کی تھی کہ بانیانِ پاکستان کے حوالے سے نوجوانوں کا پاکستان پر اعتماد اور یقین بحال کیا جائے اور یہی بات مصنف کیلئے موجودہ کتاب لکھنے کا محرک ثابت ہوئی ہے۔

سردار محمد چوہدری صاحب کا خیال ہے کہ پاکستان بن گیا مگر قائداعظمؒ کا مشن ابھی پورا نہیں ہوا۔ یہ مشن ہمارے قومی ترانے کے ایک بند میں بیان ہوا ہے۔ یعنی "پاک سرزمین کا نظام قوتِ اخوتِ عوام"۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ صورتحال کی اصلاح کا یہی وہ کلیدی نکتہ ہے جسے پاکستانی عوام کو ذہن نشین کرانے کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ چوہدری صاحب لوگوں کو پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ قائداعظمؒ کا یہ مشن سمجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اس بات بہت دکھ ہے کہ پاکستان میں بار بار جمہوریت پر شب خون مارا گیا۔ وہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آتے رہے؟ اور قوم کی گردن پر مسلط ہوتے رہے۔ ان سب کا تذکرہ آنکھوں دیکھی حقیقت کے طور پر انہوں نے اس کتاب میں کر دیا ہے۔

امید ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کتب کے ذریعے ناامیدی اور بے یقینی کی موجودہ فضا سے نکالنے میں بڑی مدد ملے گی اور ہم دعا کرتے ہیں کہ جو مقصد مصنف کے پیشِ نظر ہے، وہ پورا ہو اور من حیث القوم ہمارا سیاسی شعور بیدار ہو کر ترقی کرے۔ آمین۔

مظفر حسین

12 ربیع الاول بمطابق 16 جون 2000ء

صبحِ نو

آج دو ہزار سن عیسوی کی یکم جنوری ہے۔ یعنی اکیسویں صدی کا پہلا دن ہے۔ بیسوین صدی اپنے ہزاروں رنگ دکھا کر گذر چکی ہے۔ بیسویں صدر انسانی تاریخ میں علمی، سماجی اور سیاسی حوالے سے ایک انقلابی صدی تھی۔ اس صدی میں انسان نے فضاؤں کے دل چیر کر اڑنا سیکھا تو ساتھ ہی ذرے کو فنا کر کے دنیا کی مکمل تباہی کا نسخہ بھی ایجاد کر لیا۔ آواز کو انسان لہروں میں تبدیل کر چکا تھا مگر تصویر کو بھی وہیں پہنچا کر ٹیلی ویژن، فیکس مشینیں اور سینکڑوں دوسری ایجادات کی شکل دے دی۔ کمپیوٹر، ای میل، سی ڈی روم اور دوسرے کھلونے اسی تحیر کدہ کے نمونے ہیں۔ انسان فضاؤں کو مسخر کرنے لگا تو چاند پر پہنچ گیا ہے اور اب دوسرے سیاروں اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ مواصلات کی دنیا میں سیٹلائٹ کے ذریعے ایسا انقلاب لے آیا ہے کہ اب ساری زمین سکڑ کر ایک گاؤں بن کر رہ گئی ہے۔ ہزاروں میل دور کی خبر بھی فوراً ملتی ہے تو امریکہ افریقہ کا کلچر برقی رو پر ایشیاء کے کونے کونے میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی تیز

رفتار مواصلاتی نظام نے قومی ریاست اور قومی منجمد سرحدوں کا تصور تک ملیامیٹ کر دیا ہے۔

بیسویں صدی عجیب صدی تھی۔ اسی صدی کے شروع میں سامراج کا غلبہ موجود تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے سامراج رخصت ہو گیا اور آزادی کی موجوں کے سامنے دم توڑ گیا۔ بیسوین صدی عوام کی صدی تھی اور عوام کے راج نے فروغ پایا۔ اس صدی میں بادشاہوں کے تاج اچھلے اور جمہور کی قوت نے اپنا لوہا منوایا۔ سب سے پہلے سامراج خود اپنا شکار بنا اور اپنے ہی خنجر سے خودکشی کی طرف رواں ہوا۔ 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی جس نے کروڑوں انسانوں کی زندگیاں لے لیں۔ جرمنی ذلیل ہوا، بسمارک کا خواب ڈھیر ہو گیا۔ سلطنت برطانیہ ہل کر رہ گئی۔ خلافت عثمانیہ مرحوم ہو گئی اور امریکہ قدم بڑھانے لگا۔ آسٹر ہنگرین سلطنت بکھر گئی۔ زارِ روس عوامی قوت کے آگے زیرو ہو کر قتل ہو گیا اور 1917ء میں لینن اور سٹالن کی قیادت میں مزدور راج ماسکو پر براجمان ہو گیا۔ انگلستان ہو یا جرمنی، روس ہو یا ہندوستان افریقہ ہو، یا ایشیاء سب جگہ عوام کی قوت فیصلے کرنے لگی۔ ووٹ ہو یا احتجاج، دنیا کی تاریخ میں عوام کی رائے کا سکہ چلنے لگا۔ بیسویں صدی میں یہ ایک بنیادی اور جوہری تبدیلی تھی جو دنیا کے سیاسی اور سماجی افق پر ابھر کر آئی۔ اسی جوہر نے آگے بڑھ کر علمی اور سائنسی دنیا میں بھی جوہر دکھائے اور اب ایک عام ابنِ آدم کی آواز نہ صرف قوت تھی بلکہ علم و ہنر کا منبع بھی بنی اور عیال اللہ کی تعبیر عملی طور پر علمِ انسان نے ظاہر کر دکھائی اور دنیا واقعی آدمی شاہکار اللہ کا کنبہ نظر آئی۔ چاہے وہ قدم، قوت عوام نے اٹھایا، چاہے وہ معجزہ تیز رفتار مواصلات نے بپا کیا، نتیجہ ایک ہی تھا کہ آسمان کے نیچے سب ایک

ہیں۔ کبھی لڑ رہے ہیں اور کبھی قریب اا رہے ہیں۔ سلطنتیں ٹوٹ رہی ہیں اور نئے اتحاد بھی بن رہے ہیں۔ کہیں آسائشوں کی ایجاد ہے تو کہیں مصائب کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔

تاریخ کی یہ کشمکش بڑھتی جاتی ہے اور آخر کار 1939ء میں ایک نہایت ہی خوفناک جنگ، جنگِ عالمگیر کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ جرمنی اپنی پہلی جنگِ عظیم کی ذلت کی راکھ میں سے ایک شعلہ بن کر ابھرتا ہے اور ہٹلر کی قیادت میں پورے یورپ پر قیامت بن کر گرتا ہے۔ پولینڈ، بلیجم بیلجئم، ڈنمارک، سویڈن، ہالینڈ اور فرانس، جرمنی کے آگے چشم زدن میں سرنگوں ہو جاتے ہیں اور انگلینڈ ونسٹن چرچل کی قیادت میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتا ہے۔ جرمنی اٹلی اور جاپان ایک طرف ہیں تو دوسری طاقتیں دوسری طرف۔ 1942ء مین جرمنی روس پر چڑھ دوڑتا ہے اور جاپان امریکہ پر پرل ہاربر سے حملہ آور ہو جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا کہ پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ انگلینڈ، امریکہ اور روس 1945ء تک جنگ جیت جاتے ہیں۔ جرمنی اور جاپان ہار جاتے ہیں، مگر اس دوران ناگاساکی اور ہیروشیما کے شہر ایٹم بم کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اس جنگ میں جنگجوؤں سے کہیں زیادہ عام شہری لقمہِ اجل بنتے ہیں۔ چونکہ اس صدی میں راج بھی عوام کا ہے، اسلئے شاید مشیت ایزدی بھی یہی رہی کہ پھر وہ بھی اس کی بھینٹ ضرور چڑھیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا کا پورا نقشہ بدل جاتا ہے کہ تاریخ ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ اب آزادی اقوام کا غلغلہ ہے۔ کیوں نہ ہوتا کہ یہ جنگ پوری نوآبادیوں نے آزادی کے وعدے پر اپنے آقاؤں کے ساتھ مل کر لڑی

تھی۔ آقاؤں کی آزادی کی حفاظت کیلئے لڑنے والوں نے خود اپنے لئے بھی اسی آزادی کی آرزو کی۔ اور جنگ کے بعد آقاؤں کو آزادی دینا پڑی کیونکہ جنگ نے خود ان کے گھٹنے ٹیکا دیئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ہٹلر ہار گیا مگر بہت سے غلاموں کی آزادی کا سبب بنا۔

بیسویں صدی کے اس تناظر میں آپ کے سامنے بہت بڑی بڑی شخصیات ابھرتی ہیں۔ انگلستان کے ونسٹن چرچل ہیں تو جرمنی کے جوزف ہٹلر ہیں۔ فرانس کے ڈیگال ہیں تو امریکہ سے صدر روز ویلٹ نظر آتے ہیں۔ روس میں لینن کے بعد سٹالن کا نام گونجتا ہے اور چین سے ماؤزے تنگ سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ سائنس کی دنیا سے آئن سٹائن کی شخصیت بہت زیادہ قد آور ہے۔ ہندوستان میں کرم چند موہن داس گاندھی اور محمد علی جناحؒ کی دھاک ہے۔ اس صدی میں بعد میں آنے والوں میں ہوچی منہ آف ویت نام اور نیلسن منڈیلا کا بھی بڑا نام ہے۔ بیسویں صدی ایک بڑی ہی مردم خیز صدی ہے۔ ان چند شخصیات کے علاوہ بھی بہت بڑے بڑے نام ہیں مگر اس صدی میں جو منفرد مقام محمد علی جناحؒ کا ہے، وہ اور کسی کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کام محمد علی جناحؒ سے لیا ہے، وہ اعزاز کسی اور کو نہیں مل سکا۔ سٹانلے والپرٹ اپنی معرکتہ آراء جناح آف پاکستان میں لکھتے ہیں:

"بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو تاریخ کے دھارے کو بخوبی بدل سکتے ہیں۔ اس سے بھی کم لوگ وہ ہوتے ہیں جو دنیا کے نقشے کو بدل سکیں اور شاید ہی کوئی مائی کا لال ایسا ہو جسے کوئی قومی ریاست بنانے کا اعزاز ملا ہو۔ محمد علی جناحؒ دنیا کی وہ واحد ہستی ہے جس نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔

واقعی یہ منفرد اعزاز محمد علی جناحؒ کے حصہ میں آیا ہے، دنیا کا کوئی دوسرا شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا۔ گو ونسٹن چرچل بہت بڑا انسان تھا، اسے بحیثیت وزیر اعظم انگلستان دوسری جنگِ عظیم جیتنے کا اعزاز ضرور حاصل ہے، اگر چرچل نہ ہوتا تو شاید انگلستان ہار جاتا، مگر وہ خالقِ انگلستان نہیں ہے، وہ انگلستان کی ایمپائر کا بھی موجد نہیں ہے۔ جہاں پر وہ تھا، وہ مختلف صدیوں کے مختلف انسانوں کی کاوش تھی، اس کا اپنا کمال نہیں تھا۔ جرمنی بسمارک کی محنت تھی اور پہلی جنگِ عظیم کی تباہی تھی۔ ہٹلر آندھی کی طرح ضرور اٹھا مگر آخر کار جرمنی کو خاکستر کر کے رخصت ہوا۔ ڈیگال اور روزویلٹ بڑے ملکوں کے بڑے صدر تھے مگر کسی تخلیقی عمل سے نہیں گذرے تھے۔ لینن اور سٹالن روس میں انقلاب ضرور لائے تھے مگر مملکت روس اسی شان و شوکت کے ساتھ پانچ سو سال موجود تھی جسے پیٹر دی گریٹ نے وسعت دی تھی۔ سٹالن کی ریڈ آرمی ظلم اور تباہی کے علاوہ اور کیا کرسکی تھی۔ ستم گری دھاک ضرور بٹھاتی ہے، لیکن پھر راکھ بن کر بکھرتی بھی ضرور ہے اور لینن کا خواب ستر سال کے اندر اندر بکھر کر رہ گیا کہ ان کا کیا دھرا سب انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ چین کے ماؤزے تنگ بھی بہت بڑے آدمی تھے۔ وہ ایک انقلاب کے داعی اور نقیب تھے مگر دو ہزار سال سے چین کی مملکت قائم ودائم تھی۔ اس نے صرف وہاں کا نظام بدلا، نقشہ نہیں۔ باقی سب کچھ تاریخ کا ناگزیر تسلسل تھا۔ یہ سب لوگ بڑے لوگ تھے۔ تاریخ میں انکے نقوش انمٹ ہیں مگر یہ لوگ اس بلندی کو کبھی نہ چھو سکے جو محمد علی جناحؒ کو ملی۔ خود موہن داس گاندھی ہندوستان کی تخلیق کا دعویدار نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان تو بہت طویل عرصے سے موجود تھا۔ گاندھی نے ہندوستان نہیں بنایا بلکہ ہندوستان نے گاندھی کو بنایا مگر یہ بات آپ قائداعظمؒ

کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے تو پاکستان کو جنم دیا ہے۔ پاکستان محض ایک زمین کا ٹکڑا نہیں ہے، وہ ایک بھرپور تخلیق ہے۔ زمین تو صرف اس کا ایک پہناوا ہے اور مسلم قومیت اس کی روح ہے اور یہ سب کچھ محمد علی جناحؒ کی دین ہے، اس سارے تصور میں سے آپ محمد علی جناح کو نکال لیں۔ پھر چشمِ تصور سے دیکھیں، یکدم سب کچھ دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ اسی لئے مسلمانانِ ہند نے آپ کو قائداعظمؒ کا خطاب دیا کیونکہ وہ اس کے مستحق تھے۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے اسے باقاعدہ سرکاری حیثیت دی کہ چشمِ فلک نے اس سے بڑا لیڈر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ واقعی وہ قائد اعظمؒ تھے۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انسان تھے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ انکا ہمسر پچھلے ایک ہزار سال میں ملنا مشکل ہے۔ آپ ساری دنیا کے نقشے پر نظر دوڑا لیں اور زمانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں۔ آپ کو ان سا کوئی نہیں ملے گا۔

شاید اسی لئے ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم کی موت کے بعد کہا تھا کہ اگر مجھے بروقت پتہ چل جاتا کہ محمد علی جناحؒ تپ دق جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہیں اور اتنی جلدی انہیں موت آ لے گی تو وہ ہندوستان کی آزادی کا وقت آگے بڑھا دیتا اور محمد علی جناحؒ کی موت کا انتظار کرتا اور پھر پاکستان کبھی نہ بن سکتا۔ آپ اندازہ کریں کہ تخلیق و استحکام میں اس ایک شخص کا کتنا کلیدی کردار ہے کہ مخالف بھی اس کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہاں انگریز اور ماؤنٹ بیٹن اس تخلیق کے مخالف تھے اور انہوں نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی مضبوط اور مدلل شخصیت کے سامنے یہ سب چراغ گل ہو گئے۔ کسی بھی انسان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس کے مخالف بھی اس کا

اسطرح بھرپور اقرار کریں۔

پاکستان کیا ہے اور اسکی تخلیق کیسے ہوئی؟ اس معجزہ کو سمجھنے کیلئے تھوڑا سا تاریخ اور برصغیر پاک وہند کے جغرافیہ میں جھانکنا پڑیگا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام اور مسلمان تقریباً تیرہ سو سال پہلے محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ سندھ کے علاقہ میں داخل ہوئے جن کے حسنِ سلوک اور منصفانہ علمداری کا مقامی لوگوں نے بھرپور انداز میں استقبال کیا۔ یہ اسلامی ریاست ملتان تک پھیلی مگر محمد بن قاسم کی واپسی پر یہ سکڑ کر صرف منصورہ سندھ تک رہ گئی۔ اس کے دوسو سال بعد مسلمانوں نے اپنی پیش قدمی محمود غزنوی کی قیادت میں وسط ایشیا سے شروع کی جو سومنات تک پہنچ گیا۔ محمود کے بعد اس کے جانشینوں نے قدم بڑھائے۔ شہاب الدین غوری نے دلی فتح کرلیا۔ اس کے بعد خاندانِ غلاماں، خلجیوں اور مغلوں نے کئی سو سال تک یہاں حکومت کی۔ بکھرے ہندوستان کو ایک مملکت بنایا۔ ذات پات میں بٹے ہندوؤں میں اخوت اور مساوات کے شیریں سبق نے لوگوں کے دل موہ لئے۔ بزرگانِ دین نے ارواح وقلوب کو مسخر کیا اور بلا کسی جبر واکراہ کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کی شمعیں جلائیں۔ دین اسلام کے واضح حکم کے مطابق کسی کو بھی اپنا مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ تمام مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے مندروں کی حفاظت کی ذمہ داری نہایت سختی سے نبھائی اور اپنی تمام رعایا کو آزادی مذہب کے مواقع فراہم کیئے۔ اگر اسلام تلوار ہی سے پھیلتا تو پھر ان بادشاہوں کو کون اس سے روک سکتا تھا۔ پھر تو سارا ہندوستان ہی مسلمان ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا اور جب مغلوں کے زوال پر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں انگریز ہندوستان پر قابض ہو رہا تھا تو ہندوستان

میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کی سات سو سالہ بلاشرکت غیرے مطلق العنانیت کے باوجود مسلمان ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک تہائی تھے۔ رواداری کا اس سے بڑے ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ یہ دین اسلام کا بنیادی اصول ہے: خود خدا کا حکم ہے: لا اکراہ فی الدین: مذہب میں جبر ممنوع ہے بلکہ حکم اقرا یہ ہے: لکم دینکم ولی دین: تمہارا مذہب تمہارے لئے اور میرا مذہب میرے لئے۔ اللہ تعالیٰ مختاری مذہب کا خود ضامن ہے کہ ابلیس تک کو مجبوری نہیں بلکہ گمراہی کا مانگنے پر اختیار مل جاتا ہے۔

اس تناظر میں 1857ء تک پورے ہندوستان میں انگریز کا راج غالب آجاتا ہے۔ مغلیہ خاندان کا آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر بر مابدر کر دیا جاتا ہے اور ملکہ وکٹوریہ تخت طاؤس پر بزور شمشیر قبضہ کر لیتی ہے۔ اب ہندوستان کا مسلمان مایوس ہے۔ اس کی حکومت ہی نہیں گئی، وہ طبقہ حکمرانی سے تعلق کی وجہ سے نئے آنے والوں کے تعصب کا تختہ مشق بھی ہے۔ مسلمان کی اس مایوسی سے ہندو فائدہ اٹھاتا ہے اور مسلمان اس دام فریب کا شکار بھی ہوتا ہے اور وہ انگریز سے دوری اختیار کرتا ہے، اسکی زبان سیکھنے کو کفر کہتا ہے اور اسکے ساتھ آنے والے تصورات سے منہ موڑتا ہے۔

اس وقت انگریز اپنی پارلیمنٹ میں بحث کرتا ہے کہ اس نے ہندوستان کا کیا کرنا ہے اور اپنی 18 سالہ بحث کے بعد اس نتیجہ پہنچتا ہے کہ آخر کار اسے ہندوستان چھوڑ دینا ہے مگر چھوڑنے سے پہلے وہ اسکی تہذیب گری چاہتا ہے اور اسے سفید فام اقوام کی ذمہ داری گردانتا ہے یعنی white mans Burden ۔ بزعم خود اس ذمہ داری کو نبھانے کے نام پر وہ ہندوستان میں جدید سائنسی تعلیم کو رائج کرنا چاہتا ہے اور ہندوستانیوں کو جمہوریت سکھا کر اور درجہ بدرجہ ذمہ داریاں سونپ کر آخر کار

آزاد کرنے کا عہد کرتا ہے۔

یہ بات ہندوؤں کو بہت بھائی کہ اس جمہوری طریقے سے وہ آخر کار کئی سو سالوں کے بعد مسلمانوں پر حکومت کر سکیں گے کیونکہ جمہوریت میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں اور گنتی میں ہندو زیادہ تھے۔ یعنی اس صورت میں جمہوریت ہندو راج کی نوید تھی۔ اب ہندو کو کیا چاہئے اس کا تو صدیوں کا خواب پورا ہو رہا تھا اور اس نے بڑھ کر انگریز کی ہر بات کو سر آنکھوں پر لیا کہ اس میں ان کی حکمرانی مضمر تھی۔ ہندو انگریزی پڑھنے لگے اور جمہوریت، جمہوریت چیخنے لگے اور مسلمان ان باتوں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے سر سید احمد خان کا کہ اس عظیم صاحب نظر نے مسلمانوں کو اس خودکشی سے بچالیا اور انگریز کے قریب ہونے کا حیلہ کیا کہ اس وقت اور کوئی طریقہ باقی نہ تھا۔ آپ کے پاس قوتِ شمشیر باقی نہیں رہی تھی کہ آپ لڑ سکتے۔ آپ تو واضح طور پر ہار چکے تھے، اب سامانِ حرب کچھ اور قسم کا تھا۔ اور وہ تھا علم کا میدان، خاص طور پر جدید علمی سائنس جس پر ہمارے پرانے علماء ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ حالانکہ علم تو مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے اور حکم بھی یہی ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے اور اسلام سے زیادہ جدیدیت و آفاقیت کہیں اور ہے ہی نہیں۔ اسلام تو ساری دنیا کیلئے روشنی ہے اور ابد سے ازل تک کا پیغام ہے پھر وہ پرانا ہو کیسے سکتا ہے۔ اسلام تو ماضی، حال اور مستقبل کی شاہراہ ہے۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو اس مخمصے سے نکال کر کچھ نہ کچھ روشنی کی راہ پر ڈالا تا کہ آئندہ چل کر مسلمانانِ ہند کچھ مضبوط ہو سکیں۔ ورنہ

؎ نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے

ہندوستاں والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی

داستانوں میں

ہندوستان کے مسلمانوں کی کسمپرسی کی اس حالت پر ترس کھا کر اللہ تعالی دو عظیم ارواح اس دارِفانی کی طرف بھیجتا ہے۔ ایک سیالکوٹ پنجاب میں وارد ہوئی اور بعد میں علامہ اقبال کہلائی اور دوسری عظیم روح محمد علی جناحؒ کی ہے۔ جو 25 دسمبر 1876ء کو شہر کراچی سندھ پر پونجا جناح اور مٹھی بائی کے گھر جنم لیتی ہے۔ ہر دو کی تعلیم اپنے ہی گھر سے شروع ہوتی ہے جس کی بنیاد دین اسلام ہے۔ محمد علی جناحؒ بعد میں سندھ مدرستہ الاسلام سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کرتے ہیں اور جدید کے ساتھ ساتھ دینی علم سے روشناس ہوتے ہیں۔ وہ ایک ذہین طالب علم اور محنتی نوجوان تھے۔ کراچی بندرگارہ نہر سویز کی وجہ سے بہت اہم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے پونجا جناح کا کاروبار بہت بہتر ہوگیا۔ انہوں نے اپنے ہونہار بیٹے کو بہتر تربیت کیلئے ایک انگریزی فرم کی وساطت سے انگلستان بھیج دیا۔ نوجوان جناح نے ایک دن لنکنز ان کے دروازے پر بڑے بڑے قانون عطا کرنیوالوں میں سرورِ دو عالمؐ، رحمت اللعالمین، سرورِ کائنات، حضور نبی کریم ﷺ کا نامِ نامی، اسم مبارک دیکھا تو فوراً فیصلہ کرلیا کہ اسی دبستان سے قانون کی ڈگری لے کر بیرسٹر بنیں گے اور وہ 1896ء میں بیرسٹر بن کر واپس بمبئی آگئے۔ انگلستان میں رہائش کے دوران انہوں نے نہ صرف جدید تعلیم حاصل کی بلکہ نوروجی دادابھائی، جو کہ برٹش پارلیمنٹ کے ہندوستانی ممبر تھے، کے ساتھ کام کرتے ہوئے وہاں کی پارلیمنٹ کی عملی کارروائی کو بہت قریب سے

دیکھااوراس وقت کی لبرل تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔ جس کے مطابق آزادی فکر اور آزادی اظہار کو انسانی عمل میں بہت ہی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مساوات انسانی اور اخوت اس کے بنیادی درس تھے اور یہی اسلام کا بنیادی پیغام تھا۔ لہذا نوجوان جناح اس تحریک کا متحرک علمبردار بن گیا۔ خاص طور پر وہ لارڈ مارلے کی کتاب on Compromise سے بہت متاثر ہوئے اور ساری عمر ان ہی اصولوں پر کار بند رہے۔

1896ء میں بمبئی سے قانون کا پیشہ یعنی وکالت شروع کی۔ کچھ دیر کیلئے وہ بمبئی پریذیڈنسی کے مجسٹریٹ بھی مقرر ہوئے مگر یہ ملازمت یہ کہہ کر چھوڑ دی کہ وہ وکالت میں اس سے کہیں زیادہ آگے جاسکتے ہیں اور پھر وہ ہندوستان کے بہترین وکیل بنے۔ ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اب وکالت اور سیاست ان اوڑھنا بچھونا تھا۔ انگریز نے ہندوستان کی آزادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ 1884ء میں انگریز نے لارڈ رپن کے دور میں لوکل باڈیز کے انتظامات اور انتخابات سے ہندوستان میں جمہوری اداروں کی داغ بیل ڈالی۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق پسماندہ مسلمانوں کیلئے علیحدہ نشستوں کی بھی تخصیص کی اور یوں ہندوستانیوں کی جمہوری تربیت کا اہتمام کیا۔

1885ء میں لارڈ ہیوم کی کوشش سے انڈین کانگریس کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں ہندوستان کی ایک نمائندہ سیاسی جماعت بنی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تخت برطانیہ میں وفاداری کے اظہار سے کچھ آگے کا قدم اٹھایا نہیں جاسکتا تھا اور 1857ء کی شکست فاش کے بعد دوسرا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چونکہ انگریز نے آزادی کا وعدہ اور عہد اپنی پارلیمنٹ سے کیا تھا نہ کہ ہندوستانیوں کے کسی مطالبہ ہے نتیجہ کے

طور پر لہٰذا ہندوستانی شہریوں کیلئے ان پر اعتماد کئے بغیر اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ محمد علی جناح بھی ان ہی اعتماد کنندوں میں سے تھے اور خاص طور پر جب لارڈ مارلے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے انڈیا بن گئے، وہی مورلے جو آزادی فکر و اظہار کے اتنے بڑے مبلغ تھے۔ ایک ہندوستان لبرل راہنما گوکھلے اس وقت کانگریس میں سب سے زیادہ نمایاں لیڈر تھے اور وہ ہندو مسلم میں ذرہ بھر فرق نہیں کرتے تھے، لہٰذا اس فضا میں نوجوانوں محمد علی جناحؒ گوکھلے کے ساتھ انڈین مسلمانوں کے ایک جوشیلے اور موثر لیڈر بن کر ابھرے۔

1905ء مں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد شملہ میں وائسرائے ہند سے ملا اور ہندو کے مقابلہ میں اپنے زمیندار بھائیوں کے مفادات کیلئے ایک محضر نامہ پیش کیا اور دوران گفتگو طے پایا کہ یہ لوگ بھی اپنی ایک نمائندہ جماعت تشکیل دیں جو 1906ء میں نواب آف ڈھاکہ سلیم اللہ خان کے ہاں مسلم لیگ کے نام سے معرضِ وجود میں آئی۔ اور مسلم مفادات کیلئے کام کرنے کی ٹھانی۔ مسلمانوں کیلئے علیحدہ نیابت کا مطالبہ کیا کہ منٹو مورلے ریفارمز کے مطابق 1909ء کا ایکٹ ظہور پذیر ہونے کو تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگلستان میں لبرل فکر زوروں پر تھی۔ دراصل یورپ خاص طور پر انگلستان کی فکری تاریخ عجب ہے۔ پندرہویں صدی کے وسط سے پورا یورپ نشاۃ الثانیہ کے دور سے متعارف ہوا جس کا سرچشمہ 1453ء میں قسطنطنیہ پر عثمانیوں کے قبضہ سے شروع ہوا۔ اس سے قبل بھی سپین مسلمانوں کی علمی ضوفشانی سے فروزاں تھا مگر اب اسلامی فکر نے خوابیدہ یورپ کو بیدار کر دیا۔ نشاۃ الثانیہ کی کوکھ سے

اصلاحی تحریک نے جنم لیا اور وہی فکری سفر آگے چل کر جمہوری تحریک پر منتج ہوا جس کے بنیادی اصول قوت اخوت عوام ٹھہرے۔ دستور اور انسانی افادیت یعنی ہیومن ازم اسکے اوصاف تھے اور قانون کی حکمرانی اس کی ظاہر علامت بنی۔ یورپ نے یہ سب کچھ دینِ اسلام کے کلچرل اور سیاسی اثرات سے حاصل کیا کیونکہ سب سے پہلے انسانیت اسی سرچشمہ سے اور انہیں اقدار سے سیراب ہوئی تھی۔ شورائی نظام حضرات محمد مصطفی ﷺ ہی کی عنایت تھی اور یہی مقامِ شریعت یعنی قانون کی حکمرانی کا تھا۔ انسانی حقوق کا سب سے بڑا عالمگیر چارٹر آپ ﷺ کے الوداعی خطاب سے پھیلا جب کہا گیا کہ عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر فوقیت نہیں ہے۔ دستور کی بات میثاق مدینہ سے شروع ہوتی ہے کیونکہ یہی دنیا میں سب سے پہلا باقاعدہ لکھا ہوا دستور ہے جہاں سب شہری چاہے وہ مسلمان ہیں، یا مشرک، یہودی، ہیں یا عرب، مہاجر ہیں یا انصار، جو بھی اس دستور کا فریق ہے، وہ سب مدینہ ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار سے گذر کر یورپ اور انگلستان نے یہ سبق اسی مرکز سے سیکھا تھا ، یہ اور بات ہے کہ کبھی اعتراف کر لیا اور کبھی نہیں کیا مگر راستہ اسی مرکز سے ملا تھا۔ لہٰذا بیسویں صدی کا لبرل انگلستان محمد علی جناحؒ اور گوکھلے جیسے عظیم ذہنوں کو وسوسوں کا شکار نہیں کرتا بلکہ وہ اس پر اعتماد کرتے ہیں اور اسے موقع دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنا وعدہ نبھائے، آزادی ہند کا وعدہ۔ لہٰذا ہندو مسلم اتحاد لازم ہے، ورنہ رخنہ اندازی کا اہتمام ہے۔ یہ وہ فکر ہے جو نوجوان جناح کو متاثر کئے ہوئے ہے۔ وہ اس نصب العین کیلئے کام کرنا چاہتا ہے اور نہایت خلوص سے کرتا ہے کہ اسے آزادی پیاری ہے۔ اسی لئے وہ ہندو مسلم اتحاد کے بہترین سفیر کا لقب پاتا ہے۔ اس وقت کی ہندو قیادت بھی لبرل

اور صاف گو تھی۔ عیاری اور مکاری بہت بعد کی بات ہے، جب موہن داس گاندھی منظر پر آتا ہے۔ فی الحال معاملہ انگریز اور ہندوستانیوں کے درمیان ہے اور ہندوستانی نقطہ نگاہ کا بہترین نقیب محمد علی جناحؒ ہے۔ وہ 1909ء میں انڈین لیجسلیٹو کونسل کے بمبئی سے نہایت آسانی کے ساتھ ممبر منتخب ہو جاتے ہیں۔ وہ اسمبلی کے اندر ہوں یا باہر، جہاں بھی تھے، وہاں وہ بلا خوف اپنی نیابت کا حق ادا کرتے نظر آتے ہیں اور بمبئی کے ممنون شہری انہیں ہمیشہ اپنا نمائندہ چن لیتے ہیں۔ یہ معاملہ پھر تادم حیات چلا کہ محمد علی جناحؒ اس ہندوستان کا سب سے زیادہ درخشندہ سیاسی ستارہ ہے۔ وہ قابل بھی ہے اور سچا بھی۔ وہ غدر بھی ہے اور معقول بھی۔ وائسرائے ہو یا بازار کا دکاندار سب اسکی اہلیت اور قابلیت کا دم بھرتے ہیں۔ وہی ہندوستان کا نقیب ہے اور وہی نصیب۔ سارا ہندوستان اس کی اک اک ادا پر مرتا ہے۔ ہندو ہے یا مسلمان سب اسکا پانی بھرتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں بڑا انسان، وہ بڑا تھا بہت ہی بڑا انسان۔

رخصتِ سفر

اسی زمانے میں اقبال بھی انگلستان اور جرمنی سے تعلیم حاصل کر کے واپس آجاتے ہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں، ہندوستان وطن ہمارا۔ گاتے گاتے طلوعِ اسلام بھی لکھتے ہیں۔ انہوں نے ماضی کے شکوہ میں جھانک کر اپنے مستقبل کو صاف صاف دیکھ لیا تھا۔ وہ مغرب کے لبرل ازم کے معترف بھی ہیں مگر وہاں کا تضاد بھی انہیں صاف صاف نظر آرہا ہے۔ وہ تہذیب مغرب کو اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرتے بھی دیکھ لیتے ہیں اور انہیں یہ بھی بتادیتے ہیں کہ خدا کی بستی دکان نہیں ہوا کرتی۔ وہ خدا کی بستی ایک دفعہ پھر بسانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ خدا کی بستی ہے جسے عین چالیس سال بعد ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں نظر آنا ہے۔ پاک لوگوں کی بستی

پاکستان مگر یہ سفر بہت لمبا اور کٹھن ہے۔ اس کے راستے میں کیا کیا رکاوٹیں تھیں؟ اور وہ کتنی بڑی بڑی تھیں؟ اور پھر وہ کیسے دور ہوئیں، وہ بھی ایک عظیم داستان ہے جسے علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی عظیم جوڑی ہی عبور کر سکتی تھی۔

کانگریس اور مسلم لیگ اپنا اپنا نقطہ نگاہ لئے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ 1909ء کا ایکٹ بھی آجاتا ہے اور سب مل کر آزادی کی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1913ء میں قائداعظمؒ ان دونوں جماعتوں کے بیک وقت ممبر ہیں۔ پھر 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو جاتی ہے، حاکم و محکوم یعنی انگریز اور ہندوستانیوں میں اعتماد کا پل موجود ہے اور محکوم حاکموں کی آزادی اور خود اپنی آزادی کے لئے جرمنی سے لڑنے کیلئے تیار ہیں مگر مسلمانانِ ہند کیلئے یہ بہت کڑا وقت ہے کہ انگریز آقا کے مدمقابل مسلمانوں کی خلافتِ عثمانیہ جرمنی سے مل کر لڑ رہی ہے اور لارنس آف عریبیا (انگریز انٹیلی جنس افسر) سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے درپے ہے۔ وہ عربوں کو عثمانیوں کیخلاف لا کھڑا کرتا ہے اور اسلامی اخوت کی بجائے نسلی تفرقہ کو وجہ قومیت بناتا ہے اور عرب اسی جھانسہ میں آجاتے ہیں۔ یوں اسلامی اخوت کا رشتہ نسلی شناخت پر قربان ہو رہا ہے مگر اہلِ ہند خاص طور پر مسلمانوں کو اپنی منزل کے حصول کیلئے یعنی انگریز سے آزادی کیلئے بعض بنیادی جذبات سے گریز کرتے ہوئے گذرنا تھا اور گذرتے ہیں۔ یہی وہ بالغ نظری تھی جس کا عظیم ثبوت محمد علی جناحؒ نے دیا۔ حتیٰ کہ خود ترکی کے اندر سے خلافت کی خرابیوں کیخلاف آواز اٹھی اور مصطفیٰ کمال پاشا کمال اتاترک بابائے جدید ترکی کی قیادت میں خلافت کا بوریا بستر گول کر دیا گیا۔ یہ صورت بعد میں بنی مگر جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد جب

خلافت عثمانیہ کے حصے بانٹے جا رہے تھے۔ مسلمانانِ ہند میں سے ایک ہی آواز تھی جو ترکوں کے حق میں اٹھتی تھی اور وہ تھی محمد علی جناح کی کہ ورسیلز کے معاہدہ کے وقت ہندوستان کی نمائندگی کیلئے کم از کم ایک مسلمان ممبر ضرور لیا جائے مگر انگریز نے ایسا نہ کیا اور مہاراجہ پٹیالہ جو سکھ تھے، کو نامزد کر دیا۔ بہر صورت ایک کوشش تھی جو آخری وقت تک جاری رہی۔

جنگِ عظیم کے دوران 1917ء میں بیلفر اعلان آگیا جس میں تاج برطانیہ نے ایک دفعہ پھر اپنا عہد آزادی ہند زیادہ واضح الفاظ میں دہرایا اور جنگ کے اختتام پر ہندوستان کی حد تک 1919ء کا ایکٹ دیا، جس کے مطابق مالیات اور لاء اینڈ آرڈر کو چھوڑ کر باقی محکمے ہندوستانی انتظام وانصرام میں دینے کا اہتمام ہوا۔ یعنی ڈیارکی سسٹم (دوئی) جس کے مطابق صوبوں میں انگریز گورنر اور ہندوستانی وزیر اعظم مل کر نظم ونسق کے ذمہ دار ٹھہرے۔ ہندوستانی نمائندگی انتخابات کے ذریعہ ہونا قرار پائی۔ یہ واقعی آگے کی طرف ایک قدم تھا مگر ساتھ ہی ایمرجنسی کی آڑ میں رولٹ ایکٹ بھی آگیا جو بہت سی آزادیوں کو چھین رہا تھا۔ اس پر پورے ہندوستان سے احتجاج کے طور پر ایک استعفیٰ آیا اور وہ تھا محمد علی جناح کا۔ کہ وہ ایک اصولی انسان تھا، وہ انگریز کے ساتھ ایک اصولی جنگ لڑ رہا تھا۔ اسی زمانے میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں ایک انگریز جنرل ڈائر کے ہاتھوں قتلِ عام ہوا، جس نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا اور باہمی اعتماد چور چور ہو گیا۔

یہ وہ وقت ہے جب ہندوستان کے سیاسی افق پر گاندھی جی کا ستارہ ابھر رہا ہے، وہ ایک چالاک ہندو بنیا ہے۔ وہ جنوبی افریقہ میں اپنے عدم تشدد کے ہتھیار آزما

چکا ہے اور اب ہندوستانکو اپنی تجربہ گاہ بنا رہا ہے۔ اس کے کام کو جلیانوالہ باغ اور تحریکِ خلافت نے جذباتیت کا ضروری مصالحہ مہیا کر دیا ہے، اسکی اس جذباتیت کے مظہر کا مقصد تھا کہ آزادی کی جدوجہد کو دستوری راہوں سے نکال کر عوامی سطح پر لے جایا جائے تاکہ عوامی اکثریت جو لامحالہ ہندو اکثریت ہے، ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرے اور مستقبل صرف اور صرف ہندو غلبے ہی کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ گاندھی جی نے نہایت عیاری سے جذباتی مسلمانوں کو خلافت کے نام پر اپنے ساتھ ملایا، جس کے خاص مظہر مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ تھے اور ہندو مسلم ایکتا کا ڈرامہ رچاتے ہوئے جامع مسجد دلی تک پہنچ گیا اور مسلمانوں کو ترکِ موالات سمجھایا یعنی ہندوستان چھوڑ کر ترکی پہنچو اور جہاد کرو، دراصل گاندھی کا یہ ایک بہانہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان ہندوستان سے بھاگ جائیں اور ہندوؤں کیلئے راستہ صاف کر جائیں۔ محمد علی جناحؒ کی نگاہِ دوررس نے یہ شرارت اچھی طرح بھانپ لی جس کی وجہ سے مسلمانانِ ہند پر ایک قیامت برسنے کو تھی۔۔ اس نے گاندھی جی کو ان حرکات سے روکنے کی بہت کوشش کی اور اس حرکت میں چھپی مستقبل کی حشر سامانیوں سے آگاہ کیا کہ یوں ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو جائیگا مگر گاندھی جی کے سر پر تو ہندو غلبے کا بھوت سوار تھا۔ وہ اس کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ جلیانوالہ باغ اور خلافت تحریک کے جذباتی ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی ج ی نے دستوری جدوجہد کے بجائے عدم تشدد کے نعرہ پر مبنی تحریکِ مزاحمت شروع کر دی اور پورے ہندوستان میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ جناحؒ دیکھ رہا تھا کہ اس تلاطم کے اندر سے آزادی کے برگ و بار نہیں پھوٹیں گے بلکہ ہندو مسلم دوری اور مایوسی کے بھوت ابھرینگے، مگر آزادی

گاندھی کا نصب العین نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آزادی تو انگریز کا عہد ہے، وہ آئے گی ہی کیوں نہ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا ٹنٹا بھی ختم ہو جائے۔ کچھ ہندوستان چھوڑ جائیں گے اور جو رہ جائینگے، ان کو دبالینگے۔ اس قبیح مقصد کے لئے اب گاندھی جی ہر طرح کے احتجاج کی غیر ضروری (اسکے نقطہ نگاہ سے ضروری) آگ بھڑکاتے نظر آتے ہیں اور یہ معاملہ آئندہ تین عشروں پر پھیلا آپ کو نظر آئیگا۔ اسکے بعد گاندھی جی اور کانگریس کے تمام احتجاج بائیکاٹ اور ستیہ گرہ کے ناٹک صرف اور صرف مسلمانوں کو ان کے سیاسی حقوق اور وجود کی نفی کیلئے رچائے گئے ہیں۔ ان ناٹکوں اور جیل یاترا تماشوں کا آزادی کے حصول سے تعلق نہیں ہے،صرف اور صرف انگریز کو دباؤ میں لاکر مسلمانوں کے حقوق چھیننے کا ڈرامہ ہے تاکہ انگریز مسلمانوں کچھ دیئے بغیر ہندوستان چھوڑ دے اور کوئی دستوری فیصلہ نہ کر سکے تاکہ کوئی دستوری حق مسلمانوں کو نہ مل سکے۔

گاندھی جی کی اس چال کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی ناؤ ڈوبنے لگی تھی اور ناؤ کا ملاح محمد علی جناحؒ بھی اب مخمصے کا شکار تھا لیکن اسے اب بھی ہندوستان کی آزادی عزیز تھی اور وہ آزادی کو گاندھی جی کی عیاری و مکاری پر قربان کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے جب وہ 1924ء میں آزاد حیثیت میں منتخب ہو کر وائسرائے کونسل میں پہنچا تو اس نے فوراً اپنے آزاد ساتھیوں کا ایک گروپ تشکیل دیا اور موتی لعل نہرو کے ساتھ مل کر وائسرائے ہند کی ہر چال کو ناکام کر کے رکھ دیا۔ جناح کو اپنی ذات سے کہیں زیادہ ہندوستان کی آزادی عزیز تھی اور گاندھی کو ہندو غلبہ۔ گاندھی جی کو یہ بات بھی پسند نہ آئی اور جب سائمن کمیشن کی آمد پر موتی لعل نہرو دستوری رپورٹ مرتب ہوئی تو

گاندھی جی نے نہایت چالاکی سے اس میں مسلمانوں کا حصہ کم کروادیا۔ اب محمد علی جناحؒ مسلمانوں کا اتنا بڑا بنیادی نقصان ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس عظیم بطلِ حریت نے ہمت نہ ہاری ار نہایت محنت و جانفشانی سے اپنے 14 نکات کے ذریعے مسلمانوں کا نقطہ نگاہ بیان کیا مگر وہ کانگریس نے نہایت حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا۔ کیوں نہ کرتے، کانگریس کو تو مسلمان مفاد بھاتا ہی نہیں تھا، وہ تو مسلمان کو سیاسی طور پر تباہ و برباد دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اب فیصلہ کی گھڑی سر پر آن کھڑی ہوئی اور محمد علی جناحؒ نے فیصلہ کر لیا کہ اب ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔ اب کانگرس سے علیحدگی ہی واحد راستہ رہ گیا تھا اور وہ محمد علی جناحؒ نے بادلِ نخواستہ اپنا لیا۔ اگر نہ اپناتے تو پھر مسلم کاز سے غداری بنتی اور محمد علی جناحؒ یہ کیسے کر سکتا تھا اور واپسی کے دروازے خود کانگرس نے بند کر دیئے تھے۔ 30-1929ء کا یہ لمحہ مسلمانانِ ہند کیلئے to be or not to be کا تھا۔ کانگرس نے خود اپنی تیار کردہ دستوری سکیم بھی مسترد کر دی اور نوجوان جواہر لعل نہرو کی قیادت میں 6 جنوری 1930ء کو کانگرس کے لاہور سیشن میں انگریز سے مکمل آزادی کا اعلان کر دیا تا کہ انگریز کوئی دستوری حل دیئے بغیر ہی ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے۔ دستوری حل میں تو مسلمانوں کو ان کا حصہ مکمل طور پر ملنا تھا مگر پورنا راج میں سب کچھ ہندو اکثریت کو مل جانا تھا اور مسلمان منہ تکتے رہ جاتے اور فنا ہو جاتے، کانگریس اب ننگی ہو کر آپ کے سامنے مکمل طور پر ایک ہندو جماعت کا روپ دھارے کھڑی تھی۔ اب کیا کیا جائے؟

اب مسلمانوں کیلئے فیصلہ کی گھڑی ہے اور اسکا اعلان حضرت علامہ اقبالؒ نے اسی سال 1930ء کے سالانہ مسلم لیگ اجلاس الٰہ آباد میں کر دیا کہ مسلمانوں کا

ایک ہی مقدر ہے کہ وہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جہاں جہاں مسلم اکثریت ہے، کا علیحدہ خطہ ارض اپنے لئے لیں اور وہاں اللہ کی خلافت قائم کریں۔ جواہر لعل نہرو کے پورنا دیش کے نعرہ کے بعد مسلمانوں کیلئے بھی یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اور انہوں نے اسکا اعلان کر دیا۔ چوہدری رحمت علی صاحب نے اسی سوچ اور سکیم کا نام پاکستان یعنی پاک لوگوں کا گھر 1933ء میں تجویز کیا۔ پاکستان کے نام کی توضیح میں انہوں نے پ پنجاب کیلئے رکھا، ک کشمیر کیلئے، س سندھ کیلئے، الف افغانیہ یعنی سرحد کیلئے اور تان بلوچستان کیلئے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مشرقی علاقے کا نام بنگسام یعنی بنگال اور آسام کو ملا کر رکھا کہ وہاں پر مسلمان آبادی کثرت میں تھی۔ اب ہندوستان کے مسلمانوں کے مقدر اور منزل کا تعین ہو رہا تھا۔

کانگرس کی اس اندھی چھلانگ کے بعد مسلمانوں کے پاس کیا چارہ رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود محمد علی جناحؒ نے اس وقت کے انگریز وائسرائے اور انگلستان کے وزیراعظم میکڈونلڈ کو خط لکھ کر تجویز پیش کی کہ حکومت انگلستان اب بھی لندن میں کانفرنس بلا کر ہندوستان کے دستوری مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ کو بھی زیرِ غور رکھا جائے۔ مگر فیصلہ نمائندہ اجلاس ہ میں کیا جائے۔ لہٰذا لندن گول میز کانفرنس کا سلسلہ شروع ہوا، جس کا کانگرس نے بائیکاٹ کر دیا۔ کیوں نہ کرتے، کیونکہ انہیں تو کوئی دستوری حل درکار ہی نہیں تھا کہ یوں مسلمانوں کو حصہ مل جائیگا۔ جناح صاحب نے لندن کی دو دو کانفرنسوں میں حصہ لیا اور مسلمانوں کا نقطہ نظر پورے شدومد سے پیش کیا مگر بعد میں جب گاندھی جی ایک کانفرنس میں آئے تو تو

انہوں نے اپنا پرنالہ وہیں رکھا جہاں اسے رکھنا مقصود تھا۔ انہوں نے یہ کانفرنس اسکی کامیابی کیلئے attend نہیں کی تھی، وہ تو اسے ناکام بنانے آئے تھے۔ لہذا انگریز نے خود اپنے طور پر ہندوستان کی آزادی کو اگے بڑھانے اور دستوری حل پیش کرنے کیلئے 1935ء کا ایکٹ پیش کردیا، جس کے مطابق ہندوستان کو اس کے صوبوں اور ریاستوں پر مبنی ایک وفاق کی صورت دی گئی جس کے دو ایوان ہونے قرار پائے۔ ایوانِ زیریں براہ راست الیکشن سے قائم ہونا تھا اور ایوانِ بالا ریاستوں کی نمائندگی کرتا۔ اسی طرح صوبوں کے اندر منتخب حکومتوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ایکٹ کے مطابق پورنا دیش ملا اور نہ ہی آزادی کا فیصلہ آگے بڑھ سکا، مگر ایک قدم ضرور آگے اٹھا۔

دراصل پاکستان کا بننا مشیت ایزدی تھی۔ 1930ء تک وزیراعظم انگلستان میکڈونلڈ اس بات کیلئے تیار تھے کہ اگر ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ تسلی بخش طریقہ سے طے پا جائے تو ہندوستان کو ڈومینین حیثیت دے کر لوکل سیلف گورنمنٹ دے دی جائے۔ مگر کانگرس کی قیادت کی آنکھوں پر پٹیاں چڑھ گئیں اور انہوں نے رکابی میں پیش کی گئی آزادی کو دھتکار دیا اور مکمل آزادی کا نعرہ بلند کردیا۔ وگرنہ اسی وقت انگلستان ہدنوستان کو وہ سب کچھ دینے کو تیار تھا جو اسے 15 اگست 1947ء میں ملا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسوقت پاکستان نہ بنتا، متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کچھ سیاسی حقوق مل جاتے، جو انکا حق تھا مگر ہندو تنگ دل اور تنگ دامن تھا، وہ مسلمان کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جب جناحؒ کے 14 نکات حقارت سے ٹھکرائے تو اسکے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اپ کو معلوم ہونا

چاہئے کہ 1947ء کو ہندوستان پاکستان کو وہی ڈومینین حیثیت ملی تھی جو انگریز متحدہ ہندوستان کو تیس کے عشرہ میں دینے کی پیشکش کر چکا تھا، مگر میرے مولا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 1947ء کا آزادی ایکٹ صرف نام کا آزادی ایکٹ تھا۔ دراصل وہ قانونی طور پر ہندوستان کو وہی حیثیت دے رہا تھا جو آسٹریلیا اور کینیڈا کو ملی ہوئی تھی۔ ان کی حکومت ضرور اپنی تھی مگر راج شہنشاہِ انگلستان ہی کے نام کا تھا جو اب بھی وہاں موجود ہے۔ گاندھی اور نہرو کو بھی 1947ء میں وہی کچھ ملا مگر پاکستان کو تسلیم کرنے کے بعد۔ کیونکہ یہ میرے مولا کی مشیت تھی۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ مکار بنیا انگریز کے بعد اپنے سب عہد بھول جائے گا اور برصغیر سے مسلمانوں کا اسی طرح نام ونشان مٹا دے گا جس طرح اس کے نام لیوا سپین میں ختم ہو گئے تھے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ خدا کی ایک بستی (پاکستان) متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں سے نکال کر علیحدہ بسا دی جائے۔ اس عظیم مقصد کے حصول کیلئے آئندہ آنیوالا وقت اللہ تعالیٰ نے محمد علی جناحؒ کے قبضہ میں دیدیا۔

یہ مشیت ایزدی ہی تھی کہ 1937ء میں اس کانگریس نے یہ موقع کھونے کے بعد انگریزوں کی ماتحتی میں الیکشنوں میں حصہ لیا اور سات صوبوں میں اپنی حکومتیں بنالیں اور پھر اگلے دو سال تک وہاں مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھائے کہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ مسلمانوں کیساتھ انگریز کی رخصتی کے بعد کیا ہونیوالا ہے۔

اب مردِ حق محمد علی جناحؒ نے بھی دوقومی نظریہ کو پوری صراحت کے ساتھ پیش کیا کہ ہندوستان میں معاملہ اکثریت (ہندو) اور اقلیت (مسلمان) کا نہیں ہے بلکہ یہ قضیہ دو قوموں کے درمیان ہے۔ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں: ایک قوم مسلمان

ہے اور دوسری ہندو۔ لہٰذا انگریز جانے سے پہلے ان دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ بٹوارہ کردے۔ یہ بات سر سید احمد خان نے بھی کہی، اقبال نے بھی، اور چوہدری رحمت علی بھی کہہ چکے تھے، لیکن جو قانونی صراحت محمد علی جناح نے پیش کی، وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا اور ایسے انداز اور دلائل کے ساتھ کہی کہ سب کو سمجھ آ گئی۔ ہندوستان کے سب مسلمان تو فوراً سمجھ ہی گئے کہ دوسالہ کانگرس راج نے وہ کچھ کر دکھایا تھا کہ شاید صودیوں پر محیط دلائل بھی وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ دکھی مسلمانوں نے اپنے قائد کے حکم پر کانگریس راج کے خاتمہ پر 1939ء میں یوم نجات پورے ہندوستان میں نہایت جوش وخروش سے منا کر ثابت کر دیا کہوہ اب ہندو کانگریس کا کبھی بھی ساتھ نہیں دینگے۔ اب انگریز بھی سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور وہ سیاہی خود کانگرسی راج کے دوران مسلمانوں پر مظالم نے ان کے منہ پر اچھی طرح ملی تھی۔ یوں دوقومی نظریہ کی حقانیت کیلئےخود ہندوؤں نیسامان مہیا کیا تھا۔

1939ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی اور انگریز جرمنی کے ہٹلر کے ساتھ دست وگریبان ہوگیا۔ کانگریس نے انگریزی جنگ کا بائیکاٹ کر دیا اور صوبائی حکومتوں سے مستعفی ہوگئے مگر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ہندوستان کی آزادی کیلئے اپنی دستوری جنگ جاری رکھی۔ جنگ کا بائیکاٹ نہ کیا مگر ساتھ ہی آزادی کا نعرہ بھی بلند رکھا۔ ویسے انگریزوں کو ہندوستانی افواج وعوام کے تعاون کی جنگ کیلئے ضرورت تھی، اس مقصد کے تحت انہوں نے ہندوستانیوں سے اپنا مکالمہ جاری رکھا۔

نشانِ منزل

1940ء تک تمام سیاسی اور سماجی عوامل کھل کر واضح ہو چکے تھے۔ لہٰذا اب وقت آ گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند اپنی منزل کا صاف صاف تعین کر لیں اور وہ مسلم لیگ نے 23 مارچ کو اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں لاہور ریزولیشن کی شکل میں پیش کر دیا جو 24 مارچ 1940ء کو پورے ہندوستان کے نمائندہ مسلمانوں کے اجلاس میں مکمل اتفاق رائے سے پاس ہو گیا۔ وہ قرارداد بعد میں قرارداد پاکستان کہلائی۔ اس قرارداد کے مطابق مسلمانانِ ہندن ے مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرف کے ان خطوں اور صوبوں پر مشتمل حصوں میں مسلمانوں کی ریاستیں تشکیل دے کر انہیں مکمل آزادی دے دی جائے تا کہ مسلمان اپنے طور طریقوں کے مطابق اپنا کاروبار حکومت چلا سکیں۔ اب مسلمانوں نے انی منزل کا صاف صاف تعین کر لیا تھا اور وہ تھا حصول پاکستان۔ آزاد و خودمختار پاکستان۔ اگلے

ہی سال مدراس اجلاس میں مسلم لیگ نے ریاستوں کے لفظ کے ساتھ اکٹھے یعنی Together کے لفظ کا اضافہ کر کے ریاستوں والا ابہام بھی ختم کر دیا تھا، جس کا مطلب تھا ایک پاکستان، اب کانگریس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، وہ اپنا ہی بویا کاٹ رہے تھے۔ سوائے زہر بھری تنقید کے، ان کے پاس کوئی ٹھوس دلیل موجود نہیں تھی۔ اک شور تھا، سو وہ مچا رہے تھے۔ محمد علی جناحؒ اور مسلم لیگ نے تو مسئلے کا حل پیش کر دیا تھا، انگریز کی آمد سے قبل کونسا ہندوستان ایک ملک تھا۔ اب وہ دو حصوں میں بٹ جائیگا تو کون سی قیامت آن پڑے گی۔ ہندوؤں کے ذہن میں اتنی سی بات نہیں آ رہی تھی۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ حقائق کو جھٹلا رہے تھے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں انگریزی انتظامی علاقے کے علاوہ 562 ریاستیں موجود تھیں۔ جہاں نواب راجے اور مہاراجے حکمران تھے۔ پھر انہیں تقسیم ہند کے اتنے مناسب فارمولے پر کیوں اتنا اعتراض تھا۔ محمد علی جناحؒ تو لکم دینکم ولی دین کے فارمولے پر پاکستان کا مطالبہ کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ہادی اکبر ﷺ کی سنت مطہرہ یہی تھی اور اسے پورا ہونا تھا۔

1942ء تک جاپان برما پر قبضہ کر کے ہندوستان کی طرف بڑھ رہا تھا، اس موقع پر انگریز نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے تاکہ یکسوئی سے جنگ لڑی جائے۔ سر سٹیفورڈ کرپس انگلستان کی کابینہ کے ایک سینئر ممبر خود ہندوستان آئے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مطالبہ پاکستان کو کسی نہ کسی شکل میں ماننا ہی پڑے گا، وگرنہ معاملہ الجھ جائیگا۔ مگر یہ بات گاندھی جی کی کھوپڑی میں نہیں گھس رہی تھی، حالانکہ راج گوپال اچاریہ جیسے سینئر کانگریسی نے بھی اس سکیم کی حمایت کر دی تھی۔ گاندھی جی نے ایک شاطر بنئے کی طرح انگریزوں کی مشکل سے فائدے اٹھاتے

ہوئے Quit india یعنی انگریز دفع ہو جاؤ کا نعرہ بلند کر کے علمِ بغاوت لہرا دیا کہ بعد میں ہم جائیں اور مسلمان جائیں، تم انگریز و یہاں سے دم دبا کر بھاگ جاؤ۔ بعد میں وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کرنے والے تھے، سب پر عیاں تھا۔ اس نعرے پر اک فساد اٹھ کھڑا ہوا۔ کانگرسی قیادت جیل میں ڈال دی گئی اور انگریز انتظامیہ نے معاملات سنبھال لئے۔

اسی سال امریکہ جنگِ عظیم میں کود پڑا اور ہٹلر نے روس پر حملہ بھی کر دیا۔ اب کیا تھا، جنگ کا پانسہ پلٹنے لگا، جاپان اور جرمنی کی پوزیشن کمزور ہونے لگی اور آخر کار 1945ء میں جنگِ عظیم کروڑوں انسانوں کو بھسم کرنے کے بعد امریکیوں اور انگریزوں کی فتح یابی پر ختم ہو گئی۔ اب دنیا کا نیا نقشہ ابھرنے کو تھا اور ہندوستان کا نقشہ بھی بدلنے کو تھا۔

جرمنی کے ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ امریکہ کے صدر روز ویلٹ مر گئے اور انگلستان کے ونسٹن چرچل نیا الیکشن ہار گئے۔ یوں دنیا کے سٹیج پر نئے کھلاڑی آ رہے تھے مگر ہندوستان میں وہی پرانا کھیل جاری تھا۔ انگلستان میں اب لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی، جس کے وزیرِ اعظم ہندوستان کی جلد آزادی کے حامی تھے۔ ویسے بھی جنگِ عظیم نے انگریزوں کی معیشت کا بھرکس نکال دیا تھا۔ اسلئے فیصلہ ہوا کہ ہندوستان کی نوآبادی کو قابو رکھنے کیلئے غیر ضروری وسائل ضائع کرنے کے بجائے اسے دوستانہ ماحول میں آزاد کر کے بچت کر لی جائے، تاکہ برباد انگلستان کی تعمیرِ نو پر زیادہ توجہ دی جا سکے۔ اس مقصد کیلئے انگریزوں نے کانگرسی قیادت کو آزاد کر دیا اور ایک دفعہ پھر گفت و شنید کے دور شروع ہو گئے۔ گفت و شنید کے یہ دور چونکہ شملہ کے

شہر میں ہوئے جو کہ وائسرائے ہند کا موسم گرما کا دارالحکومت ہوتا تھا، لہٰذا یہ شملہ کانفرنسوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کانفرنسوں میں حضرت قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ نہایت موثر انداز میں پیش کیا اور وہ نقطۂ نگاہ تھا پاکستان کی تخلیق۔ اب کانگریس اور گاندھی نے حسب سابق ایسا پینترا بدلا اور کانگریس کو تمام ہندوستان بشمول وہاں کے مسلمانوں کا نمائندہ منوانے کیلئے زور لگایا۔ یہ بات حضرت قائداعظمؒ کو منظور نہیں تھی۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ ہندی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف اور صرف آل انڈیا مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ اور کانگریس یہ بات ماننے کیلئے تیار نہیں تھی۔ لہٰذا اسکا فیصلہ جنرل الیکشن پر چھوڑ دیا گیا جو 1945ء کے آخری مہینے اور 1946ء کے شروع میں ہوئے۔ اس انتخاب نے حضرت قائداعظمؒ کے موقف کی ایسی تائید کی کہ شاید ہی دنیا میں اسکی مثال ملتی ہو۔ وہ اس طرح کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے تقریباً تمام مسلم سیٹوں پر بھرپور کامیابی حاصل کرلی اور کانگریس منہ تکتی رہ گئی۔ اب کانگریس کے پاس صرف مولانا ابوالکلام آزاد جیسے درشنی مسلمان اور کانگریس کے تنخواہ دار ملا ہی رہ گئے تھے وگرنہ عامۃ المسلمین نے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دے کر تمام سیاسی اختیارات قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ اب انگریز کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ محمد علی جناحؒ ہی کے منہ سے مسلمانوں کا نقطۂ نظر سنتا، مگر یہ کانگریس کو منظور نہیں تھا کہ وہ تو اسی پرانی ڈگر پر چل نکلے تھے۔ وہ تو مسلمانوں کے وجود تک کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ گاندھی انہیں حقارت سے مٹھی بھر Convert کہہ کر پکار رہا تھا، لہٰذا ہندو مسلم کشمکش اب آخری حدوں کو چھونے لگی تھی اور اس کی تمام

تر ذمہ داری گاندھی اور اس کی تنگ نظر کانگریس پر عائد ہوتی تھی۔ محمد علی جناحؒ نے تو آخری وقت تک صلح جوئی کی کوشش کی تھی۔ اگر کسی نے نفاق کی طرح ڈالی تھی تو وہ گاندھی تھا۔ اب محمد علی جناح اس سٹیج پر آ کر کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ مشیت ایزدی نے اسے مسلمانوں کا مسیحا کا رول عنایت کیا تھا اور وہ اسے ادا کرنا تھا اور اس اللہ کے بندے نے ایسا ادا کیا کہ چشمِ فلک نے ایسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑا انسان تھا۔ وہ مسلمانوں کا واقعی بہت بڑا لیڈر تھا۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بکھری اور پٹی پٹائی بھیڑ کو اب ایک قوم بنا دیا تھا۔ اب وہی بھیڑ ایک طاقتور قوم بن چکی تھی اور یہ سب کچھ اس عظیم انسان نے کیا تھا۔ اب اس قوم کو اس کے مقدر کے حصول سے کون ہٹا سکتا تھا۔ کوئی انہیں انگریز اور ہندو دونوں مل کر بھی نہیں۔ کوششیں بہت ہوئیں مگر قائداعظمؒ کی مضبوط قیادت کے سامنے سب ڈھیر ہوگئیں۔ وہ ایک مضبوط چٹان تھے اور پھر وہ ڈٹ گئے اور دنیا کی تاریخ میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی معجزہ سے کم نہیں تھا۔

معاملات اب ایسی نہج پر پہنچ چکے تھے کہ اب تقسیمِ ہند کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ تمام طرفین کو اب پاکستان کی حقانیت کا احساس ہو چکا تھا، لہٰذا آخری وقت میں ایک دفعہ پھر انگریزی حکومت کی طرف سے کوشش ہوئی کہ ہندوستان تقسیم سے بچ کر ایک وحدت ہی رہے۔ اس مقصد کیلئے حکومت انگلستان نے اپنی کابینہ کے تین سینئر ممبران پر مشتمل ایک کیبنٹ مشن ہندوستان روانہ کیا تا کہ تمام فیصلے موقع پر ہی ہوسکیں۔ یہ مشن 1946ء کے شروع میں آیا اور بہت زیادہ محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد اس نے اپنی معروف رائے دی، جس کے مطابق ہندوستان کو اے بی سی تین

گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ اے اور بی گروپ میں وہ صوبے اور خطے تھے جو ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں واقع مسلمان اکثریت کے علاقے تھے اور باقی ماندہ حصہ سی یعنی ہندو علاقہ کہلوایا۔ تجویز یہ تھی کہ ہندوستان ایک یونین ہوگی جو ان تین گروپوں پر مشتمل ہوگی۔ یونین کے پاس دفاع، مواصلات، فنانس اور خارجہ کے محکمے رہینگے، باقی سب معاملات میں صوبے اور گروپس خودمختار ہونگے۔ خودمختاری میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر یہ گروپس دس سال بعد یونین سے علیحدہ ہونا چاہیں تو وہ جدا ہونے کا بھی حق رکھتے تھے۔ ہندوستان کو ایک رکھنے کی یہ آخری کوشش تھی۔ اس سکیم میں چونکہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کم از کم کاغذوں کی حد تک موجود تھی، اس لئے حضرت قائداعظمؒ نے باوجود اس کے کہ اس میں ان کا مطالبہ پاکستان پورا نہیں تھا، یہ سوچ کر مان لیا کہ آخر کار اس میں علیحدگی کا حق تو موجود ہے ہی۔ جب وہ وقت دس سال بعد آتا تو یہ کاغذی وعدہ پورا ہوتا یا نہیں، وہ الگ بات ہے، مگر قائداعظمؒ نے یہ بات مان لی کہ کسی صلح حدیبیہ کے بعد ہی فتح مبین ملتی ہے۔ وہ تو اپنے ہادی اکبر ﷺ کا پیروکار تھا اور عملی طور پر انکی سنت پر چل رہا تھا۔ کانگریس نے یہ سکیم بہت دیر بعد اور بہت سے تحفظات کے ساتھ مانی مگر چند دن بعد ہی جواہر لعل نہرو صدر کانگریس کے اس بیان کے بعد کہ ہم دستور ساز اسمبلی میں کسی معاہدے کے پابند ہو کر نہیں جا رہے، وہ ایک خودمختار ادارہ ہے، ہندوستان کے مستقبل کے تمام فیصلے وہیں ہوں گے، وہ کیبنٹ سکیم دفن ہو کر رہ گئی۔ قائداعظمؒ نے سوچا کہ انگریز کی موجودگی میں بھی اگر کانگریس کا یہی غیر معقول اور بے لچک رویہ ہے تو پھر انگریز کے چلے جانے کے بعد کیا ہوگا۔ اب فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی اور یہی اللہ کو منظور تھا، وگرنہ مسلمانوں کے

ساتھ ہاتھ ہو جاتا، وہ تو اچھا ہوا کہ جواہر لعل نہرو نے اپنے خبثِ باطن کا اظہار کر دیا۔ اس پر قائداعظمؒ پکار اٹھے کہ اب ہم کس کے پاس فریاد کریں، اب کوئی ایسی عدالت نہیں رہ گئی کہاں کوئی وکالت کی جا سکے۔ اب ایک ہی عدالت بچی ہے، وہ اللہ کی عدالت ہے اور اللہ کے مسلمان بندوں کی عالت جس سے ہندوستان کا مسلمان رجوع کر سکتا ہے۔ اب مسلمان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہوگا اور اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ یہ پس منظر تھا جس میں حضرت قائدِ اعظمؒ نے 16 اگست 1946ء کو چشمِ فلک نے وہ نظارہ دکھایا، جس سے ساری دنیا ہل کر رہ گئی۔ مسلمان باہر نکلا مگر ہندو نے بھی ظلم کی انتہا کر دی۔ صرف کلکتہ شہر میں چار ہزار لاشیں بے گور وکفن پڑی تھیں اور پورے ہندوستان میں خون ہی خون تھا۔ مسلمانوں کیلئے یہ قربانی ضروری تھی اور انہوں نے یہ قربانی بخوشی ادا کی۔ اب کیا تھا کہ انگریز بھی انگشتِ بدانداں تھا تو ہندو بھی حیران تھا، اب پاکستان بنائے اور تسلیم کئے بغیر کیا چارہ رہ گیا تھا، وگرنہ ہندوستان سول وار کی نذر ہو کر بھسم ہو جاتا۔

یہ تھی وہ صورت حال، 1946ء کے آخری حصہ میں جب ایک دفعہ پھر کوئی عبوری حکومت بنانے کیلئے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی، تا کہ حالات میں کوئی سدھار لایا جا سکے۔ کانفرنس پہ کانفرنس منعقد ہوئی، مگر کانگریس کی وہی چال بے ڈھنگی تھی، وہ حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اور بضد تھی کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی بھی کرنے کیلئے کم از کم ایک مسلمان وزیر ضرور دیگی۔ یہ بات قائداعظمؒ کیسے مان لیتے۔ عوام نے اپنے ووٹ سے اور بعد میں خون سے فیصلہ لکھ دیا تھا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف اور صرف مسلم لیگ کو ہے۔ اس بات پر آ کر انگیز نے کانگریس کے خوف

سے بدعہدی کردی اور کانگریس کو عبوری حکومت کی تشکیل کیلئے کہہ دیا، مسلم لیگ نے بائیکاٹ کر دیا، اب بات کیسے بن سکتی تھی، معاملات اور الجھ گئے، وائسرائے ہند لارڈ ویول نے بہت زیادہ محنت کر کے آخرکار مسلم لیگ کو منالیا اور وہ عبوری حکومت میں شامل ہو گئے مگر اب ہندو مسلم جنگ باقاعدہ اس عبوری حکومت کی کابینہ کے اندر شروع ہو گئی اور سب کام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ بات بات پر تو وائسرائے اپنا ویٹو استعمال کرنے سے رہا۔ لارڈ ویول نے بھی تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہندوستان کو اس طرح چھوڑ دیا جائے کہ جس صوبہ میں جس جماعت کی اکثریت اور حکومت ہے، وہ صوبہ اس کے حوالے کر کے بتدریج انگریزی افواج وہاں سے نکال لی جائیں، اس طرح تو ہندوستان بہت سے حصوں میں بٹ جانا تھا جو کانگریس کو قطعاً منظور نہیں تھا۔ اس سکیم کا نام بھی اس نے اپریشن سکٹل رکھا۔ بحری جہاز جب ڈوبنے سے نہ بچ رہا ہو تو آخری لمحات کی اذیت کو کم کرنے کیلئے جہاز کا عملہ خود جہاز کو جلدی سے غرق کرنے کیلئے جو کام کرتا ہے، اسے سکٹل کہتے ہیں اور ہندوستان کے جہاز کو اب ڈوبنا ہی تھا جو کہ تمام تر کانگریس کا کیا دھرا تھا۔ اسلئے وائسرائے کی رائے میں اس سکٹل کرنا ہی بہتر تھا۔ اس سکیمکو جب حکومت انگلستان نیدیکھا اور اس پر غور کیا تو وہ ہل کر رہ گئے۔ اب معاملات بہت پیچیدہ اور گنجلک ہو گئے تھے۔ اگر کوئی علاج تھا تو صرف محمد علی جناحؒ کا فارمولا اور وہ تھا پاکستان کی تخلیق۔ اس میں مسئلے کا حل بھی تھا اور آسانی بھی۔ ان حالات میں اس سے بہتر کوئی حل موجود ہی نہیں تھا۔ دوسری تمام صورتیں مکمل تباہی کی تھیں مگر عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے۔ عدل اور عقل سے عاری لوگوں ہی کیلئے تو صم بکم عمی فھم لا یرجعون کی ترکیب قرآن مجید استعمال کرتا ہے اور یہ سب اندھے لوگ

وہ تھے جو اس وقت تک بھی پاکستان سکیم کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ حکومت انگلستان نے لارڈ ویول کی تبدیلی کا فیصلہ کرلیا اور کسی ایسے شخص کی تلاش شروع کر دی جو فوری فیصلے کر کے اس قضیہ کو جلد سے جلد ختم کر دے اور اس کیلئے قرعہ فال لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام نکلا جو کہ بادشاہ وقت کا فرسٹ کزن اور مشرقی کمان کا سپریم کمانڈر تھا۔ ماؤنٹ بیٹن جادوگر مشہور تھا۔ فوری فیصلوں کی قوت رکھتا تھا اور ایک وجیہہ نوجوان تھا اور اس کی خوبرو بیوی کا معاشقہ جواہر لعل نہرو کے ساتھ چل رہا تھا شاید کہ یہ بات وقتِ ضرورت کام آئے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے ہند اپنا نیا کام سنبھالنے کیلئے 22 مارچ 1947ء کو نئی دہلی پہنچا۔ اسکی خوبرو بیوی بھی اسکے ساتھ تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان روانگی سے پہلے وزیراعظم انگلستان سے یہ اعلان کروادیا تھا کہ انگلستان بہرصورت جون 1948ء سے پہلے ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ذمہ دار ہاتھوں میں دے دے گا، اس ڈیڈ لائن کے مقرر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی قائدین اپنے شدید اختلافات ختم کر کے کسی دستور ساز فارمولا پر رضامند ہوجائیں مگر وہ فارمولا سوائے تقسیمِ ہند اور پاکستان کو تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا اور یہ کانگریس کو کسی قیمت پر بھی منظور نہیں تھا اور قائداعظمؒ کو اس کے علاوہ کچھ قبول نہیں تھا۔ اس مرحلہ پر گاندھی جی نے ایک آخری چال چلی اور کہا کہ قائداعظمؒ کو متحدہ ہندوستان کا وزیراعظم بنادیا جائے۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات قائداعظمؒ سے کی تو انہوں نے فوراً انکار کردیا اور کہا کہ وہ اپنی ذات کیلئے کوئی عہدہ تلاش نہیں کررہے۔ وہ تو اپنی قوم کا حق مانگ رہے ہیں اور وہ ہے ان کیلئے علیحدہ مملکت

پاکستان۔ اس عظیم انسان کے سامنے گاندھی جی کے سب پتے بیکار تھے۔ وہ شخص ذاتی لالچ سے بالاتر، ناقابلِ خرید انسان تھا۔ وہ بہت بڑا انسان تھا۔ اللہ کا مومن مردِ حق، بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان۔

بہت سے بھاگ دوڑ اور ملاقاتوں کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر اس کا پیشرو لارڈ ویول پہنچا تھا۔ کہ جہاں جہاں جس جس صوبہ میں جس جس جماعت کی حکومت ہے، اسے ہی اس علاقہ کی حکومت سونپ دی جائے۔ مگر یہ بات اسکے دوست جواہر لعل نہرو کو منظور نہیں تھی۔ اس طرح تو ہندوستان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر بہت سی ریاستوں میں بٹ جاتا۔ ادھر ہندو مسلم فسادات زوروں پر تھے اور ہر جگہ ہنگامہ خیزی، لوٹ مار، قتل و غارت اور آتش زنی تھی۔ قریب تھا کہ ہندوستان سول وار کا شکار ہو جائے، لہٰذا فوری حل کی ضرورت تھی اور وہ حل تھا تقسیم ہند مگر جناح صاحب کی سوچ کے مطابق نہیں۔ اب پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو بھی تقسیم کرنا پڑے گا، وگرنہ دونوں طرف بہت بڑی بڑی اقلیتیں رہ جاتیں۔ اگر اقلیت کے اصول پر تقسیمِ ہند لازم تھی تو پھر ان صوبوں کی تقسیم بھی اسی اصول کے مطابق ناگزیر تھی اور قائداعظمؒ جیسے قانون دان اور اصول پسند انسان کو یہ بات ماننی پڑی کہ منطقی اصول یہی کہہ رہے تھے۔ یہ کام قائداعظمؒ کیلئے بہت مشکل تھا مگر بڑے آدمیوں کو کٹھن فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے یہ کڑوا فیصلہ اپنے سر کی ایک معمولی سی جنبش سے 3 جون 1947ء کو مان لیا اور جب اس سکیم کا آل انڈیا ریڈیو سے اعلان ہوا تو خود قائداعظمؒ نے اپنی تقریر کے اختتام پر پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کیا اور یوں مشیت ایزدی پایہ تکمیل کو پہنچی۔

دشتِ خارزار

اب تک کی اس مختصر تفصیل سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہ کتنا کٹھن کام تھا جو قائداعظمؒ کے عزم صمیم اور قوم کی قربانیوں کی وجہ سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ چونکہ انگریزوں اور ہندوؤں نے تخلیق پاکستان کو بادل نخواستہ اور حالات کی مجبوری کے تحت قبول کیا تھا، اسلئے اسے ختم کرنے اور تباہ کرنے کیلئے انہوں نے پہلے ہی دن سے سر دھڑ کی بازی لگادی اور اس مقصد کیلئے ہر غلط کام کیا۔ سب سے پہلے رقبہ کی تقسیم میں ڈنڈی ماری اور تقسیم کے انگریز ثالث ریڈکلف نے صوبہ پنجاب کے گورداسپور اور فیروز پور ضلع کے وہ علاقے جو مسلم اکثریت پر مشتمل تھے۔ ہندوستان کو دے دیئے تاکہ ریاست کشمیر کیلئے ہندوستان کو آل سیزن راستہ مل سکے۔ ریڈکلف کی ثالثی چونکہ

تسلیم کر لی گئی تھی، لہٰذا اسے ماننے بغیر چارہ نہیں تھا۔ دوسرا قضیہ نہرو کی ضد نے ریاست کشمیر پر ڈال دیا، حالانکہ وہاں کی 85 فیصد آبادی مسلمان تھی اور کشمیر اصولاً پاکستان سے الحاق کرتا مگر ہندو مہاراجہ کے ساتھ ملی بھگت کر کے نہرو نے وہاں ہندوستانی فوجیں داخل کر دیں، وہ جھگڑا آج تک دونوں حکومتوں کے درمیان چل رہا ہے۔ تقسیم سے پاکستان کے حصہ میں وہ علاقہ آیا، جہاں کوئی دارالحکومت نہیں تھا، کوئی انڈسٹری نہیں تھی، کوئی ریاستی ادارہ نہیں تھا، کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی، کوئی پولیس نہیں تھی، کوئی سول سروس نہیں تھی، گو عدالتی ڈھانچہ موجود تھا، جبکہ ہندوستان کے حصہ میں یہ سب کچھ انگریزی وراثت میں سے آ گیا تھا۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ لارڈ مونٹ بیٹن نے عملی آزادی اور تبدیلی اقتدار کی تاریخ 30 جون 1948ء کی بجائے پہلے لا کر 15 اگست 1947ء کر دی تا کہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت سنبھل ہی نہ سکے۔ ہندوؤں نے مزید یہ ظلم ڈھایا کہ ہندوستانی علاقہ میں رہنے والے مسلمانوں پر ہندو اور سکھ غنڈوں کے جتھوں نے راتوں رات حملے شروع کر دیئے۔ قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا، ننھے بچوں کو نیزوں اور بھالوں پر اچھال دیا اور خواتین کو اغوا کر کے بے حرمتی کرنا شروع کر دی تا کہ مسلمان ان علاقوں سے بھاگ کر پاکستان کی راہ لیں اور وہاں اتنی تعداد میں مہاجر پہنچ جائیں کہ یہ نوزائیدہ مملکت ان کے بوجھ تلے آ کر دم توڑ جائے ۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کیا گیا۔ نام نہاد باؤنڈری فورس جس کی پنجاب میں کمان بریگیڈیئر ایوب خان (بعد کے صدر ایوب خان) کے پاس تھی، محض ایک تماشائی تھی۔ تمام مظالم کے باوجود ایوب خان اور اس کی فورس نے فسادات روکنے کی ذرہ بھر کوشش نہ کی۔ 14 اگست 1947ء کو پاکستان کے پاس کوئی فوج نہیں

تھی مگر اسکے باوجود پاکستان بن گیا کہ یہ مشیت ایزدی تھی۔ پاکستان کی فوج ہندوستان کا وہ مسلمان تھا جو اس کے لئے ہر قربانی کیلئے تیار تھا اور اسی کے اس جذبے نے پاکستان کی تخلیق کا معجزہ کر دکھایا۔ فوج تو بہت بعد میں پاکستان اور اسکے عوام نے بنائی۔ پاکستان کی فوج تو 27 اکتوبر تک بھی کہیں نہیں تھی، جب ہندوستان کی فوج نے باقاعدہ کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ پاکستان میں موجود انگریز کمانڈر انچیف نے تو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کا حکم تک نہ مانا اور اپنے اصل آقا آکن لیک اور مونٹ بیٹن کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ بد قسمتی سے ہمارے جرنیل پہلے ہی دن سے کسی قومی فوج کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ کیسے کرتے، وہ تو انگریز کے تربیت یافتہ اور ذہنی غلام تھے اور یہ ذہن بہت دیر تک قائم رہا ہے اور موجود ہے۔

ان تمام مسائل کے باوجود قائداعظم محمد علی جناحؒ کے عزمِ صمیم اور بصیرت نے اس خدا کی بستی (پاکستان) کی ایسی پختہ اور مضبوط بنیاد رکھی کہ دشمن کے ہزار نہ چاہنے کے باوجود وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ دشمنوں کا پختہ خیال تھا کہ یہ ملک چھ مہینوں سے زیادہ نہیں چل سکے گا مگر جس قوم کے حوصلے بلند ہوں اور جس کا قائد محمد علی جناح جیسا عظیم انسان ہو، وہ ان تھپیڑوں سے کہاں گھبراتے ہیں۔ محمد علی جناحؒ نے جو چراغ جلایا تھا، وہ تمام تر طوفانوں کے باوجود روشن سے روشن تر ہوتا گیا کیونکہ اس کی بنیاد بہت مضبوط اور اللہ کے ابدی پیغام پر مبنی تھی۔ یہ وہ پختہ خیالی تھی جسے کوئی طوفان ہلا نہیں سکتا تھا اور یہ چٹان تھی اسلام کا آفاقی اور لافانی پیغام جسے محمد علی جناح نے حرزِ جان بنا کر اور جان پر کھیل کر اس منزل تک پہنچایا تھا تاکہ برصغیر کے مسلمان اپنے رب کا نظام اس خطہ ارض پر نافذ کر سکیں۔ یہ پیغام قوم اور اسکے قائد کے روئیں روئیں

میں رچا بسا تھا۔ یہی اسکی قوت تھی اور یہی اسکی منزل تھی۔ اس مقصد کیلئے زمین تو محض ایک ٹکڑا تھا اور وہ حاصل ہوگیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ 14 اگست 1947ء کو جب لارڈ ماونٹ بیٹن تبدیل اقتدار کیلئے کراچی آیا تو اس نے تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اب جبکہ آپ کو آپ کا پاکستان مل چکا ہے تو طرزِ حکمرانی اور رواداری کیلئے آپ کا آئیڈیل ہندوستان کا مغل بادشاہ اکبر اعظم ہونا چاہئے۔ اس پر قائداعظمؒ نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ جہاں تک آئیڈیل کا تعلق ہے، ہمارا آئیڈیل اکبر اعظم نہیں ہوگا۔ ہمارا آئیڈیل ہمارے ہادی اکبر حضرت محمد مصطفی ﷺ ہونگے، جو ہمیں رواداری رحمت مساوات اور اخوت کے تمام سبق چودہ سو سال پہلے پڑھا چکے ہیں اور ہماری ریاست کیلئے نمونہ بھی ریاست مدینہ ہوگی۔ آپ نے دیکھا روح اسلام کس طرح ان کے روئیں روئیں میں گھر کر چکی تھی۔ اس جس کی بنیاد ابدی اور ازلی پیغام ہو اسے کون مٹا سکتا تھا اور مٹا سکتا ہے، یہ تھی وہ اصلی قوت جس نے یہ معجزہ ممکن کیا تھا۔ پاکستان کی قوت اسکی فوج نہیں اسکا نظریہ تھا۔ نظریئے نے قوت پیدا کی نہ کہ کسی فوج قوت نے نظریہ پیدا کیا۔ فوج کے بغیر ہی کشمیر کا بہت بڑا حصہ قوت عوام نے آزاد کروالیا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم جمہور اور جمہوریت پر لازوال اعتماد رکھتے تھے کہ اسلام کا یہی بنیادی سبق ہے۔۔ انہوں نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ جمہوریت مسلمانوں کے خون میں ہے۔ جمہوریت انگریزوں سے نہیں سیکھی، ہم نے تو جمہوریت 14 سو سال پہلے سیکھ لی تھی۔ انگریزوں نے ہم سے جمہوریت سیکھی ہے اور جمہوریت ہی ذریعہ ہم اپنی منزل مقصود پالینگے اور پھر پالی۔

دشمن کی ہزارہا سازشوں کے باوجود پاکستانیوں اور انکے عظیم قائد کے سچے

جذبوں نے کراچی میں نیا دارالحکومت بھی بنالیا، فوج بھی کھڑی کر لی، سول اور پولیس سروس بھی بن گئی اور عدالتی ڈھانچہ بھی مرتب ہوگیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر ایک جدید فلاحی، جمہوری اور اسلامی ریاست کے تمام خدوخال تیار تھے۔ اسے کہتے ہیں قیادت کا کمال کہ مصائب کے کوہ گراں بھی روشن صبح خیر بن گئے۔ لاکھوں کروڑوں مہاجر بسا دیئے گئے کہ انصار کے جذبے عظیم تھے اور ایک دفعہ پھر 14 سو سال پرانی تاریخ دہرائی جا رہی تھی جب مواخات کا معجزہ بپا ہوا تھا۔ وہی رنگ ڈھنگ اب اس خدا کی بستی پاکستان کا تھا۔ خدا کی کرنی دیکھئے اور قائد کا کمال کہ کشمیر کے معاملہ میں بھی بھارت کو لینے کے دینے پڑ گئے، ان کی وہاں فوج بھی تھی اور ہمارے صرف مجاہد۔ نہتے مجاہدین مگر پھر ہندوستان ایسا ڈرامہ کرتے کرتے یو این او میں پہنچ گیا اور سیز فائر کیلئے دہائی دے دی۔ قائداعظمؒ تو عظیم تھا اور عظیم ہے۔ وہ تو بہت بڑا انسان تھا ہم فقیروں کو بھی بڑا بنا گیا۔ ہمیں ایک پہچان اور شان دے گیا۔ وہ واقعی بیسویں صدی بلکہ صدیوں پر محیط بہت بڑا انسان تھا اور ہمیشہ رہے گا۔

ترا ایمان محکم تھا، ترا فرمان قائم ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ عظمت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کو انکی اسلام سے والہانہ محبت کی وجہ سے عنایت فرمائی تھی۔ان کا اوڑھنا بچھونا اسلام کا آفاقی پیغام تھا جو ان کی شخصیت کے اندر ایک عظیم حسن پیدا کرتا تھا۔اور اور علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے عظیم مسلمان مفکر ہی نہیں مجتہد بھی تھے۔انہیں اچھی طرح طرح سے معلوم تھا کہ ہند میں سجدہ کی اجازت کا مطلب آزادی دین نہیں نہیں ہے۔اس کیلئے تو امامت کا اختیار درکار ہے اور اس کا برصغیر کے مسلمان سے حساب لیا جائیگا۔امامت کے بغیر نماز، روزہ کافی نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے علامہ اقبال اور قائد اعظمؒ جیسے عظیم اذہان اور ارواح کی جرورت ہوتی ہے جو امت ہاشمی کی ہیئت ترکیبی کو سمجھنے کا ادراک رکھتی ہوں۔ یہ بات ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی جیسے عام فہم ملاؤں کے ذہنوں میں کب آسکتی تھی۔ بیسوں صدی کا سب سے بڑا اجتہادی مسئلہ برصغیر کے مسلمانوں

کیلئے ایک علیحدہ شناخت کی بنیاد پر حصول مملکت تھا۔ جہاں اسلامی ریاست کا جدید دور میں نمونہ پیش کیا جا سکے، اسی لئے قائداعظمؒ پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری اور تجربہ گاہ کا نام بھی دیتے تھے، وہ ملت اسلامیہ کو آزاد اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے اور اس کیلئے یہ سب کچھ اشد ضروری تھا اور وہ انہوں نے حاصل کر ہی لیا۔ ان کے فکر کی ایک جھلک دیکھئے 21 اکتوبر 1939ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں مروں تو یہ یقین اور اطمینان لیکر مروں کہ مرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل، میرا اپنا ایمان اور میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناحؒ تم نے واقعی مدافعتِ اسلام کا حق ادا کر دیا۔ تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجالائے۔ مرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں اسلام کے علم کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔"

دیکھا ان کے ایک ایک لفظ سے ان کی اسلام کی محبت کس طرح جھلکتی ہے، وہ واقعی اسلام کا بطلِ عظیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے علامہ اقبالؒ کی فکر کی گہرائی میں ڈوب کر مسلمانوں کی بکھری بھیڑ کو ایک زندہ قوم بنایا۔ اور پھر اس طاقت کے بل بوتے پر اس وقت کی سپرپاور برطانیہ کو ان کے میدان میں اور انداز میں شکست فاش دی۔

برطانیہ نے تین عشرے قبل ہی تو اسلام کے آفاقی پیغام کی روح کے برخلاف سلطنت عثمانیہ کو نسل اور زبان کے باطل نظریہ قومیت کی بنیاد پر تتر بتر کیا تھا اور اسلامی کی بجائے ترک اور عرب کا رنگ چڑھا دیا تھا بلکہ عرب کو عرب سے بھی لڑا دیا تھا۔ مگر اس عظیم انسان محمد علی جناحؒ نے تیس سال کے اندر اندر اسلامی فکر اور اقدار کے احیاء سے دینی شناخت پر مبنی ملتِ ہاشمی کی قوم پاکستان کو اسی برطانیہ سے منوا اور بنوا کر چھوڑا کہ یہ اس کے ہادی اکبر ﷺ کی سنت مطہرہ تھی۔ یہ ان کے مسلم قومیت کے نظریے کا اعزاز تھا کہ ہندو اور انگریز کی متحدہ قوت کے باوجود اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی فکر کا مرکزی نقطہ آپ حضور ﷺ کا مکمل اتباع تھا اور ہر کام کیلئے وہ وہیں سے روشنی حاصل کرتے تھے۔ آپ نے 11 اگست 1947 کو جب کراچی میں پہلی دفعہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب فرمایا تو آپ کی دوررس نگاہ نے مستقبل میں آنے والے تمام بنیادی مسائل کو دیکھ لیا اور پھر کہہ دیا تھا تاکہ اس نوزائیدہ قوم کی عملی راہنمائی ہو سکے۔ آپ نے انے والی قوتوں کیلئے ایک مکمل چارٹر دیا اور اس چارٹر کا مرکزی خیال آپ نے میثاق مدینہ سے لیا۔ انہوں نے صرف پاکستان بنایا ہی نہیں، اس کے مستقبل کی روشیں بھی روشن کیں۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے پر شکریہ ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے جو بات کی وہ اس اسمبلی کی اہم ذمہ داریوں کی یاددہانی تھی کہ ان کے ذمہ دستور سازی اور قانون سازی کا کتنا اہم فریضہ ہے۔ اب آپ ایک آزاد اور خودمختار مملکت ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی ذمہ داری بھی دوچند ہو جاتی ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ کسی بھی حکومت کی سب سے پہلی ذمہ داری وہاں امن

عامہ قائم کرنا ہے تا کہ وہاں کے شہریوں کی جان و مال اور ان کے مذہبی اعتقادات کی پوری پوری حفاظت ہو سکے۔

اسکے بعد انہوں نے رشوت اور بددیانتی کی لعنت سے دور رہنے کی تلقین فرمائی کہ ایک اچھی اسلامی حکومت کی یہ بنیادی پہچان ہے۔

اسی طرح چور بازاری سے چھٹکارا کی تلقین کی کیونکہ اس وقت دوسری جنگِ عظیم اور تقسیم ہند کی وجہ سے یہ کج روی بہت عام ہو چکی تھی۔

اس طرح کے وعظ و تلقین کے بعد انہوں نے نئی مملکت کے دو بہت ہی اہم مسائل اور جہتوں کا بہت ہی خوبصورت، بنیادی اور حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کر کے اسکا حل پیش کیا۔ تقسیم لازم تھی۔ اور پھر ہجرت بھی انتہائی تکلیف دہ تھی مگر یہ وقت قیمت ہے جو اہلِ ایمان کو دینی ہی پڑتی ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے بھی یہ قیمت دینا پڑی تھی، اسی لئے تو ان کے درجے بلند ہو گئے تھے۔ مگر مومن کا فرض ہے کہ سر تسلیم فوری طور پر خم بھی کرے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی، تبھی جا کر پھر اصل فوز و فلاح ملتی ہے۔ پاکستان اور اسکا شہری اپنی تخلیق کے وقت وہیں کھڑا تھا جہاں کہ مصیبت اٹھانے والے مہاجر چودہ سو سال پہلے کھڑے تھے اور اس کا سہرا حضرت قائداعظمؒ کے سر تھا۔ اس صورت حال کا احاطہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تقسیم ہند اور تقسیم پنجاب و بنگال سے پوری طرح متفق نہیں ہیں۔ اس کے خلاف بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ مگر اب یہ بات قبول کی جا چکی ہے۔ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اب ہم اس معاہدہ کا نہایت ایمانداری اور وفاداری سے احترام کریں اور اس پر عمل کریں۔ یہ سب کیلئے ضروری

ہے اور مکمل پابندی کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر یاد رکھئے جیسے میں یہ بات بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ یہ عظیم انقلاب جواب آ چکا، وہ اپنی نوعیت میں بے مثل اور منفرد ہے۔

اس وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی دوسری صورت ممکن بھی تھی۔ عملی طور پر کوئی اور دوسرا راستہ موجود بھی تھا جس پر چلا جا سکتا تھا۔ نہیں، تقسیم ناگزیر تھی۔ بھارت اور پاکستان کے دونوں اطراف بہت سے لوگ ہیں جو تقسیم سے متفق نہیں ہیں، بہت سے لوگ ہیں جو اسے پسند نہیں کرتے لیکن میرے خیال میں اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی تو موجود نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ اسکے حق میں فیصلہ دے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جوں جوں وقت گذرے گا، حقیقی تجربہ ثابت کر دے گا کہ یہی ایک واحد حل تھا۔ متحدہ ہندوستان کا آئیڈیا عملی طور پر پنپ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے خیال میں اس صورت میں مکمل تباہی ہمارا مقدر کہلاتی۔ یہ سب کچھ وقت ثابت کر دے گا۔"

اور وقت نے اس بالغ نظر انسان کا ایک ایک لفظ سچ کر دکھایا۔ محمد علی جناحؒ واقعی بہت بڑا انسان تھا اور مستقبل کا دل چیر کر دیکھ سکتا تھا۔ اسے کہتے ہیں عظیم مدبر۔ وہ سب کچھ صاف صاف دیکھ رہا تھا یہی عظیم قیادت کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہ نعرہ بازی اور جذباتیت سے بہت بلند اٹھ کر دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ قائداعظمؒ محمد علی جناح کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔ مزید فرماتے ہیں:

"تقسیم ناگزیر تھی، اسکے سوا اور کوئی حل موجود ہی نہیں تھا، تو اب ہم کیا کریں۔ اب اگر آپ اس مملکت کو خوش و خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو آئیے ہم سب مل کر عوام خاص طور پر غریب لوگوں کی بہتری اور فلاح کیلئے اپنی توانائیاں مرکوز و مجتمع

کر دیں۔ اگر آپ ماضی کی تلخیوں اور دشمنیوں کو بھول کر مل جل کر کام کرینگے تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اگر آپ اپنے ماضی کو تبدیل کر سکیں اور بھول سکیں کہ آپ کے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کیسے تھے۔ اپ بھول جائیں کہ اس کی ذات پات کیا تھی۔ اسکا رنگ اور فرقہ کیا تھا اور یاد رکھیں کہ آپ اول، دوم اور آخر کار مملکت پاکستان کے شہری ہیں، جن کے حقوق و فرائض سب برابر ہیں۔ اگر آپ نے یہ کر لیا تو پھر آپ کی ترقی و رفعت کی کوئی حد نہیں رہ جائیگی۔ آپ سب اس مملکت کے برابر کے آزاد شہری ہیں۔''

ذرا فتح مکہ کا منظر آنکھوں کے سامنے لائیں، جہاں آپ حضورﷺ نے سب خون بہا معاف کر دیئے تھے اور سب سے پہلے اپنے عزیزوں کے خوف معاف فرمائے تھے۔ معافی میں ہی کامرانی ہوتی ہے۔ بدلہ بد کا کام ہوتا ہے۔ بڑے لوگ بدلے کی بات نہیں کرتے، وہ ماضی میں پھنس کر بھی نہیں رہ جاتے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انسان محمد علی جناحؒ کی شخصیت میں موجود تھا کیونکہ اسکا ہادی اکبرﷺ انسانیت کی کایا پلٹ کا مظہر تھا۔ وہی اس کا آئیڈیل تھا اور ملجا و ماویٰ تھا۔ جسے یہ مل گیا اور اور کیا چاہئے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: تم آزاد ہو، مندر جانے میں آزاد ہو، تم مسجد جانے کیلئے آزاد ہو، جو بھی آپ کی عبادت گاہ ہو، آپ وہاں جا سکتے ہیں۔ آپ کا کوئی بھی مذہب ہو یا ذات پات ہو، اس کا ریاستی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ذات پات، رنگ یا برادری کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ہی ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔ یہ ہمارا

آئیڈیل ہے اور ہمیں اپنا آئیڈیل اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہاں ہندو ہندو نہیں رہ جائے گا اور مسلمان مسلمان نہیں رہ جائیگا، مذہبی معنوں میں نہیں، وہ بات اپنی جگہ قائم ودائم رہے گی کیونکہ مذہب ہر ایک کا نجی معاملہ ہے۔ میں یہ بات سیاسی طور پر ایک مملکت کے شہری کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ میری رہنمائی ہمیشہ انصاف اور احسان کے اعلیٰ واضح اصول کریں گے، جسے سیاسی لغت میں بلاتعصب و بدنیتی یا دوسرے الفاظ میں بلاطرفداری وبلا جانبداری کہتے ہیں۔ اگر ہم نے ان ارفع واعلیٰ اصولوں کو اپنا مطمع نظر بنایا تو آپ دیکھیں گے کہ پھر پاکستانی دنیا کی بہت بڑی قوموں میں سے ایک بنے گی۔

آپ حیراں ہونگے کہ اس تقریر کی تمام تر روح دنیا کے سب سے پہلے تحریر شدہ دستور یعنی میثاق مدینہ سے ماخوذ ہے۔ محمد علی جناحؒ اپنے مشکل سے مشکل فیصلوں میں اسی چشمہ ہدایت سے رہنمائی لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے بھی مدینہ ہجرت کے بعد جب وہاں کے تمام قبائل بشمول یہودیوں کے ساتھ امورِ ریاست کو چلانے کا چارٹر ترتیب دیا تو اس دستور سے منسلک تمام فریقوں کو اس ریاست کے برابر کے شہریوں کا درجہ دیا اور ان کے معاملات کو ان کی شریعت کے مطابق طے کرنا قبول فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی بعض قبائلی رسوم کو بھی، جو اسلام سے متصادم نہیں تھیں، کو قبولیت بخشی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی پہلی ہی تقریر میں ان بہت سے مسائل کی گتھیاں عین اسلام کے مطابق سلجھادیں۔ یہ انکی عظمت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

بعض دوست جو اس تقریر کے حوالے سے قائداعظمؒ کو سیکولر ثابت کرنے کی

کوشش کرتے ہیں، وہ اصل میں بہت بڑی فکری غلطی کا شکار ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ سیکولرازم کیا ہے اور اسلام کیا ہے۔ سیکولرازم بیچارہ تو اسلام کے مقابلہ میں ابھی طفلِ مکتب ہے۔ محمد علی جناحؒ نے یہ سب کچھ سیکولرازم سے نہیں، بلکہ اسلام سے اخذ کیا ہے۔

سیکولرازم نہ صرف غیر مکمل فلسفہ ہے بلکہ اسکی بہت سی قسمیں بھی ہیں۔ یورپی سیکولرازم بے خدا ہے جبکہ انگلینڈ اور امریکہ کا سیکولرازم خدا پرست ہے۔ ملکہ برطانیہ تو خود چرچ آف انگلینڈ کی سربراہ ہے۔ وہاں کا سیکولرازم کیسے بے خدا ہو سکتا ہے، دراصل سیکولرازم کوئی فلسفہ نہیں ہے، تو یورپ کی ظالم بادشاہتوں اور پادریوں کے مظالم کے خلاف ایک ردِ عمل کا نام ہے، جس کا وجود اسلام میں سرے سے ہی نہیں ہے۔ اسلام کی اصلی صورت آپ حضورﷺ کی تعلیمات اور خلفائے راشدین کی پریکٹس ہے۔ اس کے بعد کے معاملات کچھ ملوکیت اور ملائیت کی وجہ سے خلط ملط ہیں۔ محمد علی جناحؒ کا آئیڈیل کوئی ملوکیت یا ملائیت کا دور نہیں تھا۔ ان کا آئیڈیل آپ ﷺ کی ذات اور مدینہ کی ریاست تھی اور اس بات کا ذکر انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منہ پر 14 اگست 1947ء کو نہایت صراحت سے کر دیا تھا۔ اسلئے اس تقریر کو سیکولر کے نامکمل و تشنہ فلسفہ کی روشنی میں دیکھنا خام خیالی ہے۔ ہاں اسلام میں ملائیت اور پیشوائیت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اور ملائیت کو اسلام کہہ دینا غلطی تھی۔ اور ایسی غلط فہمی ضرور دور ہونی چاہئے تھی اور وہ اس مردِ مجاہد نے آغاز ہی میں دور کر دی تھی۔ سیکولرازم کے اندر بھی جو اچھے نکتے ہیں، وہ اس نے یورپی نشاۃ الثانیہ کے دوران اسلام ہی سے حاصل کئے ہیں۔ مساوات کا اصول ہو یا قانون کی حکمرانی، جمہوریت کا درس ہو یا

انسانی حقوق کی بات ہو، ان سب کا اصل منبع اسلام ہے اور محمد علی جناحؒ کا قلب اسلام ہی میں ڈھلا ہوا تھا اور ہمیشہ یہی ان کا مطمح نظر رہا اور اس کیلئے انہوں نے کام کیا۔ اسلام میں کسی رجعت پسندی یا قدامت پسندی کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ تو جدیدیت و جدت کا دین ہے، وگرنہ آذر اپنے بیٹے ابراہیم کی جدت پسندی پر کیوں خفا ہوتا۔ ابراہیم تو نمرود کی روش بدلنے کا نام ہے۔ موسیٰ فرعون کی فرعونیت کا باغی ہے۔ محمد عربی ﷺ قریش کے بتوں کا باغی ہے اور جب بھی وہ دعوتِ اللہ دیتا ہے تو مشرک پکار اٹھتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے آباء و اجداد کے مذہب سے دور کرنا چاہتا ہے۔ ہاں یہی تو ہر داعی اسلام کا کام ہے، آپ اسے کبھی بھی قدامت پسند نہیں کہہ سکتے، وہ ہمیشہ ہی جدت پسند ہوتا ہے، ہمیشہ ہی جدید ہوتا ہے، وہ تو آفاقی اور ہمیشہ رہنے والے پیغام کا امین ہے، وہ کیسے قدامت پسند ہوسکتا ہے۔ سیکولرازم قدامت پسند ہوسکتا ہے، مگر اسلام کبھی نہیں اور یہی محمد علی جناحؒ کا فلسفہ تھا اور اسی فلسفے کی ترجمانی 11 اگست کی تقریر کر رہی ہے۔

محمد علی جناحؒ نے مسلمانانِ ہند کیلئے محض ایک قطعہ ارض ہی نہیں لے کر دیا بلکہ اس ریاست کے بنیادی خدوخال بھی مرتب کیے۔ اس نے ریاست پاکستان کے اکثر ادارے بالکل صفر سے شروع کر کے چند مہینوں کے اندر اندر تخلیق کر دیے۔ اس نے لاکھوں کروڑوں مہاجروں کو کسی بیرونی بین الاقوامی امداد کے بغیر آباد کر دیا۔ اس نے اپنی توانا قوت فکر سے ہزار میل دوری کے باوجود ملک کے دونوں جغرافیائی بازوؤں کو ایک متحدہ مملکت کی صورت دی۔ اس کی عظمت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کونسا معجزہ ہوسکتا تھا۔ وہ اس نے کر دکھایا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے صرف

جغرافیائی معنوں میں ایک نئی مملکت کو جنم نہیں دیا بلکہ اسکی فکری سمت کو نہائیت وضاحت سے متعین کردیا۔اس نے اپنے پہلے ہی خطاب میں اسے ایک جمہوری، جدید،فلاحی اور اسلامی مملکت کے خطوط پر استوار کرنے کا عندیہ دے دیا۔ جہاں انصاف اور مساوات کا بول بالا ہوگا، جہاں کے سب شہری امورِ مملکت کیلئے برابر ہونگے۔ انہوں نے پہلے ہی دن میں یہ سبق دیدیا کہ ہندوستان میں تو دوقومیں بستی تھیں،اب جبکہ پاکستان بن گیا ہےتو پاکستان کے اندرقوم بستی ہےاوروہ ہے پاکستانی قوم۔ دیکھا، بابائے قوم نے ہمیں کتنے بڑے کنفیوژن اورتضاد سےایک لمحہ میں باہر نکال دیا۔اسے کہتے ہیں بصیرت اور یہ قائداعظمؒ ہی کا کمال تھا۔وگرنہ کچھ کم عقل لوگ تواب تک اسی تضاد کا شکار ہیں،اور کچھ کم بخت نسل اورزبان کے بت کی بنیاد پر پانچ قوموں تک کاراگ الاپ رہے ہیں۔ جوآدمی بڑا ہوتا ہے،وہ بہت دور کی بات کودیکھ لیتا ہے۔

اسی ایک موقع پرنہیں، حضرت قائداعظمؒ نے بعدمیں بھی وہ جہاں جہاں گئے،اس بات کا اعادہ کیا کہ تم نسل اورزبان کے چکرمیں پھنس کر نہ رہ جانا اور نہ ہی فرقہ واریت کا شکار ہوجانا،تم ایک قوم ہو، یہی تمہاری قوت ہے۔ علاقائیت اور صوبائیت تمہارے لئے زہرِ قاتل ہے۔انہوں نے قومی یک جہتی کی خاطر نئی مملکت کو سرکاری زبان تک کا خود فیصلہ کروایا اوراپنی زبان سے ڈھاکہ میں غیرمبہم الفاظ میں کہاکہ ہماری قومی زبان اردو ہوگی۔ حالانکہ ان کی اپنی اردو کچھ کمزورتھی مگراسے اپنی ذات سے کیا،وہ توجیتا اورمرتا ہی اپنی قوم کیلئے تھا۔

حضرت قائداعظمؒ نے پاکستان کے لئے نئے دستور کے بنیادی نکتے بھی

متعین کر دیئے تھے۔ پاکستان کی چونکہ بنیاد ہی اسلامی اور جمہوری تھی، اسلئے اسے بننا ہی جمہوریہ تھا۔ دستور فہمی اور دستور سازی، محمد علی جناح سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کا تو پیشہ ہی وکالت تھا اور وکالت بھی ایسی کہ ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی قابلیت اور ذہانت وفطانت کا لوہا ایک زمانہ مانتا تھا۔ 1916ء سے لے کر 1947ء تک جتنی بھی دستوری سکیمیں ہندوستان میں آئیں، وہ ان ہی کے ذہنِ رسا کی تخلیق تھیں۔ اتنا بڑا عالم آئین اپنی ہی مخلوق ریاست کیلئے کیوں نہ دستور کے بنیادی خطوط متعین کرتا، انہوں نے کئے۔ وہ سب کے سب اسلام سے ماخوذ اور انسانی علم کی معراج سے حاصل کئے تھے۔ مگر ایک عظیم جمہوریت پسند کے طور پر وہ چاہتے تھے کہ عملی طور پر کام دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ ہی پایہ تکمیل کو پہنچے۔ دستور محض ایک کتاب نہیں ہوتی کہ مصنف اس لکھ کر دے دے۔ یہ عوام اور ان کے نمائندوں کے جذبات اور خیالات کی عکاسی کا نام ہوتا ہے اور وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کے تمام خطوں اور صوبوں کے عوامی نمائندے مل کر یہ بنیادی کام کریں۔ ہاں ایک استاد اور قائد کے طور پر وہ راہنمائی کا حق ادا کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی طرح بھی یہ شائبہ بھی گذرے کہ کوئی آئین عوام پر ٹھونسا جا رہا ہے، چاہے وہ خود قائداعظم ہی کا تیار کردہ آئین کیوں نہ ہو۔

قائداعظم نے ریاست کے تمام طبقات کیلئے اپنے خطبات کے ذریعہ تفصیلی ہدایات ہی نہیں دیں بلکہ انکے دائرہ اختیار و فرائض کو بھی احسن انداز سے متعین کیا۔ سرکاری ملازموں بشمول جرنیلوں کے شاہی امور میں مداخلت سے بار بار باز رہنے کو کہا اور سیاستدانوں کو سرکاری ملازموں کے کاموں میں مداخلت سے روکا۔ وہ عظیم شخص

کاروبارِ حیات اور خاص طور پر کاروبارِ مملکت کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔

وہ ہر کام میں میرٹ اور انصاف کو پسند کرتے تھے اور یہی اسلام کا سبق ہے۔ انہوں نے تو 1912ء میں اعلیٰ سروسز کیلئے نامزدگیوں کی زبردست مخالفت کی تھی اور مواقبلے کے امتحان کے ذریعہ سروسز کو پر کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اب جبکہ وہ خود اپنی ہی مخلوق ریاست پاکستان کے گورنر جنرل تھے تو وہ کیوں نے میرٹ کو اپنی اولین ترجیح بناتے اور انہوں نے اسے بنایا۔

حضرت قائداعظمؒ نے ریاست کے ڈھانچے، عدالتی اداروں کی تخلیق و ترویج اور سروسز کی تربیت پر ہی توجہ نہیں دی، انہوں نے ریاست کے معاشی ڈھانچے کو کھڑا کرنے میں بھی بہت زیادہ دلچسپی لی۔ اور معاش و اقتصاد کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کیلئے بنیادی خطوط متعین کئے۔ سخت بیمار ہونے کے باوجود سٹیٹ بنک کی عمارت کا سنگِ بنیاد خود رکھا اور اپنے خیالات سے قوم کو نوازا۔

اسی طرح پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی خطوط خود قائداعظم نے متعین کئے۔ سب قوموں سے برابری کی سطح پر دوستی اور کسی سے دشمنی نہیں، کے بنیادی اصول کو اپنی خارجہ پالیسی کی کلید قرار دیا، حتیٰ کہ بھارت سے بھی باوجود اتنی بے انسانی اور تلخی کے برابری کی بنیاد پر دوستی اور امن کا ہاتھ بڑھایا اور فرمایا کہ ان دونوں پڑوسیوں کے درمیان امریکہ اور کینیڈا جیسے باہمی تعلقات سے ہونگے۔ مگر جواہر لعل نہرو نے ایک دفعہ پھر کشمیر کا قضیہ کھڑا کر کے ان کے اتنے عظیم خواب کو بے تعبیر کر کے رکھ دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تعلقات کشیدہ کر کے برصغیر کو غربت اور بے چارگی کا شکار کر دیا۔ قائداعظم نے تو سب ہی کی بہتری چاہی تھی۔ وہ تو متحدہ ہندوستان پر اکتفا کر جاتے۔

اگر ہندو کا بغل اور تنگ دلی آڑے نہ آتی۔ اور اب دونوں خود مختار ملک تھے، تو بھی امن ودوستی کی آواز محمد علی جناح کی طرف سے آئی، مگر نہرو نے گڑبڑ کر دی۔ حضرت قائداعظمؒ نے اپنی خارجہ پالیسی کا ایک اہم نکتہ اسلامی ملکوں کے ساتھ ہر صورت میں دوستی کو قرار دیا۔ ویسے یہ نکتہ ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے رہا اور تحریک پاکستان کے دوران بھی انہیں احساس تھا کہ پاکستان صرف برصغیر کے مسلمانوں کا ہی محافظ نہیں ہوگا بلکہ وہ پورے عالم اسلام کا محافظ ہوگا۔ 1946ء میں لندن کانفرنس سے واپسی پر قاہرہ رکے تو ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ میں پاکستان صرف برصغیر کے مسلمانوں ہی کی لئے نہیں چاہتا بلکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وقت آنے پر وہ پوری اسلامی دنیا کیلئے ایک عظیم محافظ کا رول ادا کریگا۔ پاکستان تمام اسلامی دنیا کیلئے ہے اور اسلام کیلئے ہے۔ دیکھا، کسقدر دوررس نگاہ حضرت قائداعظم کی۔ واقعی وہ بہت بڑا انسان تھا بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان اور وقت نے یہ سب کچھ ثابت کردیا ہے۔ پاکستان آزاد ہوا تو پھر سارا مشرق وسطیٰ بھی آزاد ہوگیا۔ انڈونیشیا بھی آزاد ہوگیا، ملیشیا بھی آزاد ہوا، افریقہ بھی آزاد ہوا اور لیبیا بھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وسطِ ایشیا کی مسلمان ریاستیں بھی پاکستان کے طفیل آزاد ہوئیں، کیونکہ روسی استعمار کی ٹوٹ پھوٹ پاکستان ہی کی مدد سے ممکن ہوئی۔ پھر یورپ میں بوسنیا اور کوسووا بھی پاکستان کی طرز پر ہی آزادی سے ہمکنار ہوئے اور چیچنیا کی کہانی بھی یہی ہے۔ یہ سب کچھ میرے عظیم قائد نے بہت عرصہ پہلے دیکھ لیا تھا۔ وہ عظیم ہی نہیں، بلکہ عظیم تر تھے۔

خدا کی بستی، پاکستان کا یہ خالق اپنی زندگی کے شاہکار کی تخلیق کے ایک سال اندر اندر استحکام وترقی کیلئے بنیادیں اٹھاتا اٹھاتا اور کام کرتا کرتا، 11 ستمبر 1948ء

کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور ان کی وہ خواہش جو انہوں نے 1939ء میں ظاہر کی تھی کہ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک محمد علی جناحؒ تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علمِ اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے، اس کے اظہار کے پورے نو سال بعد ان کی یہ دعا پوری ہوگئی۔ انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کے غلبہ کیلئے نہ صرف پاکستان بنایا بلکہ اسکی مضبوط بنیادیں بھی استوار کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندے کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ یہی اصل فوز و فلاح ہے جو اس عظیم انسان کو ملی اور وہ محنت کرتے کرتے شہیدِ پاکستان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اپنے جوار رحمت میں رکھے۔ قائداعظمؒ تو نے جو کہا، وہ کر دکھایا۔

قائداعظم محمد علی جناح کراچی میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں کی خاک میں دفن ہو کر اب استراحت فرما رہے ہیں۔ ایک ممنون و مشکور قوم نے وہاں (کراچی میں) ایک شاندار مقبرہ تعمیر کر رکھا ہے، جو مرجع خلائق ہے۔ باہر سے آنے والا ہر بڑا شخص قائداعظم کے مقبرے پر حاضری ضرور دیتا ہے اور ان کی عظمت کو سپاس پیش کرتا ہے۔ یہ اس کا نصیب تھا کہ ساری عمر راست گوئی اور اپنی قوم کی خدمت میں گذار کر مخدوم بن گیا۔

راہِ منزل سے انحراف

جنوری 2000ء میں جونئی صدی کا آغاز ہے، ہم جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سفر کا آغاز تو بہت اعلیٰ تھا جو برصغیر کے مسلمانوں کی مجموعی روحانی اور اخلاقی میراث کی نشاۃ الثانیہ سے شروع ہوا۔ اقبال اور محمد علی جناح جیسے انسانوں نے جس ورثہ کی آبیاری کی اور ایک بکھری ہوئی بھیڑ کو قوم بنا کر اس کی قوت سے خدا کی بستی بسا دی مگر اس سفر میں کہیں کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے کہ کچھ لوگ اس بستی کو ایک ناکام ریاست تک کا نام دیتے رہتے ہیں۔ کچھ پریشان لوگ مادرِ وطن کو پاکستان کی بجائے مسائلستان کہہ دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہا جو شروع ہی سے تصورِ پاکستان کے خلاف تھے۔ دراصل وہ لوگ تو قابلِ معافی ہیں کہ ان کی آنکھیں تو بند تھیں۔ اور ان کے دلوں پر زنگ آلود قفل چڑھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا بہترین جواب تو خود میرے قائد نے اپنی 11 اگست 1947ء کی تقریر میں

دیا ہے کہ تقسیم کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ہر دوسری صورت بدترین تباہی کی حامل تھی۔ اس پر مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا اور نہ ہی میں اس سے بہتر کوئی اور جواب دے سکتا ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قائد کی رحلت کے بعد وہ کیا عوامل تھے یا وہ کیا کوتاہیاں تھیں جو ہم سے سرزد ہوئیں کہ اتنا عظیم خواب بے تعبیر ہو کر رہ گیا اور آج ہم آزادی کے تقاکرسے محروم ایک ذلت کا احساس لیئے اپنے زخموں کو چاٹتے اور نفسیاتی پژمردگی کا شکار اکیسویں صدی میں داخل ہو رہے ہیں۔

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کے وجود سے انکار سوائے حماقت اور خوش فہمی کے اور کچھ نہیں ہے۔ حب الوطنی کا تقاضا یہ نہیں کہ ہم اس اہم سوال کو ٹال کر قالین کے نیچے دھکیل دیں اور قومی نغمے الاپ کر غیر حقیقی دنیا بسالیں اور آنکھیں بند کر کے ذلتوں کے سفر پر چلتے رہیں۔ اگر ہم یہ سوال ٹال بھی دیں تو نئی نسل اور باقی دنیا ہمیں نہیں بخشے گی۔ میری اولاد اور انکی اولاد مجھ سے یہ سوال کرنے میں بالکل حق بجانب ہے اور ہمیں اسکا حقیقی جواب ضرور ڈھونڈنا چاہیئے۔ اور اس کا جواب ہماری آنکھوں کے بالکل سامنے واضح طور پر موجود ہے۔ اگر ہم نے اس سوال کا صحیح جواب پالیا اور اپنے فرض کی تشخیص درست طور پر کر لی تو کوئی بڑی بات نہیں کہ ہم ایک دفعہ پھر اپنی اصل منزل کی طرف بلندیوں کو ساتھ لیکر چل پڑیں۔

کیا پاکستان کی ہیئت ترکیبی میں کوئی مہلک خرابی تھی جس کی رٹ وہ لوگ لگاتے رہے ہیں جنہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی؟

نہیں، اس بستی کی ہیئت ترکیبی میں کوئی بنیادی خرابی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔

بلکہ یہ ارضِ پاک تو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ جنت کا ٹکڑا ہے، جہاں ہر شے وافر مقدار میں موجود تھی اور موجود ہے۔ اس کا پانی بہترین ہے اور اسکے دریا ٹھاٹھیں مارتے ہیں۔ اس کے میدان، کھلیان اور کوہستان بہترین ہریالی اور حیات ہی نہیں رکھتے، اعلیٰ ترین معدنیات اور زیرِ زمین بے بہا خزانوں کے امین ہیں۔ جہاں قدرتی گیس سے لیکر کوئلہ، نمک، سب کچھ موجود ہے۔ پاکستان کا محلِ وقوع وسطِ ایشیا، مشرق اوسط اور مشرقی ایشیا کا دل ہے کہ اس خطہ کے بغیر کسی اور کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے۔ خود بھارت اور چین اس کے سٹریٹجک محلِ وقوع کے محتاج ہیں۔ اس سرزمین کے انسان بہترین انسان ہیں۔ یہاں کا غریب جفاکش اور محنتی ہے اور ہنرمند لوگ پوری دنیا کو اپنا گرویدہ کیئے ہوئے ہیں۔ یہاں کا عام بندہ اپنے اللہ اور رسول ﷺ کا شیدائی ہے کہ ہر لحظہ وہ شہادت کیلئے تیار ہوتا ہے۔ پاکستان بنا تو یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی اور پھر قائد کی محنت نے اسے فکری استقامت اور سمت بھی دی۔ اور جو لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ ملک چھ ماہ کے اندر اندر ختم ہو جائیگا، ان کے منہ میں آج تک خاک رہی ہے۔ یہ اسی قوم کا کریڈٹ ہے کہ اس نے بقول اشفاق احمد خان کانٹے سے سفر شروع کیا، کہ شروع شروع میں تو یہاں ایک کامن پن بھی نہیں تھی، اور ہم ببول کے کانٹوں سے سرکاری فائلیں جوڑتے تھے۔ مگر پھر اسی قوم نے کہوٹہ کا معجزہ کر دکھایا۔ کانٹے سے کہوٹہ تک کا سفر کو ایک عظیم داستان ہے۔ اسلیئے خرابی ہیئت ترکیبی میں نہیں تھی اور نہ ہی ہے بلکہ رفعتوں کے بعد جو عبرت ناک ذلت قوم کو جھیلنی پڑ رہی ہے، یہ سب کچھ بعد کا کیا دھرا ہے۔ اس کی ذمہ دار ہماری بیوروکریسی اور جرنیل شاہی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کیلئے ہمیں قائد کے بعد کی اپنی تاریخ پر ایک مختصر مگر ناقدانہ

نگاہ ڈالنی پڑے گی تا کہ بات سمجھنے میں آسانی ہو۔ قائد کی سیاسی ٹیم بڑی عظیم تھی، یہ ٹیم قائد نے خود تیار کی تھی اور ان کی اپنی عظمت کی دلیل تھی۔ اس ٹیم میں لیاقت علی خان ،سردار عبدالرب نشتر، خواجہ ناظم الدین، آئی آئی چندریگر، ممدوٹ، چوہدری محمد علی، ممتاز دولتانہ، محمد حسین چٹھہ، خان عبدالقیوم خان، نورالامین، اے کے فضل حق، حسین شہید سہروردی، فیروز خان نون اور اسی نوع کے چمکدار ہیرے موجود تھے جن کا ایک خوبصورت گلدستہ قائداعظم کی رحلت کے بعد موجود تھا اور انہوں نے مل کر پاکستان کی ناؤ کو بڑھ کر سنبالا دیا اور ہمارے قدم آگے ہی بڑھتے گئے۔ یوں قائداعظم کا لایا ہوا انقلاب اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی گیا۔

مگر یاد رکھئے کہ ہر انقلاب کا ایک ردِ انقلاب بھی ضرور ہوتا ہے اور انقلاب دشمن قوتیں ہمیشہ گھات لگائے بیٹھی رہتی ہین۔ تاریخ کے اس اٹل اصول سے انقلاب پاکستان بھی نہیں بچ سکتا تھا اور نہ ہی بچا۔ قائد کی رحلت کے بعد ان قوتوں نے اپنا سر اٹھانا شروع کر دیا اور انہوں نے اپنا یہ کام ظاہر طور پر نہایت ہی خوبصورت اور دلکش نعروں، ناموں اور کاموں سے شروع کیا، جن کی وجہ سے یہ انقلاب آخر کار اپنی سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ آیئے نہایت اختصار کیساتھ ان قوتوں اور افراد شناخت کرنے کی کوشش کریں۔

بریگیڈیئر (بعد میں جنرل) اکبر اور بریگیڈیئر لطیف نے سال 1948ء یعنی تخلیق پاکستان کے اگلے ہی سال خان لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان کے قتل کا منصوبہ تیار کیا۔ وہ لیاقت علی خان جو اپنے قائد کے ساتھ تحریک و تخلیق پاکستان میں اپنا گھر بار لٹا دیتا ہے اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے مگر تخلیق پاکستان کو ممکن بنا دیتا ہے اور

1948ء میں وہ استحکام پاکستان کے لئے مرکزی کردار ہے۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ جس بریفنگ کے دوران یہ مکروہ فعل سرزد ہونا تھا، وہ ملتوی ہوگئی۔ یہی صورت حال اگلے سال1949ءمیں ہوئی اور پھر1950ء آگیا۔ اسے کرشمہ قدرت ہی سمجھیئے کہ کسی نہ کسی طرح یہ مکروہ عمل پایہ تکمیل کو نہ پہنچا وگرنہ یہ لوگ اپنا کام دکھا گئے تھے۔ آخرکار یہ دشمنِ وطن پکڑے گئے اور وہ معاملہ راولپنڈی سازش کیس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا بہانہ کشمیر کا جذباتی ایشو تھا کہ ان کے کہنے کے مطابق لیاقت علی خان نے وہاں کچھ کمزوری دکھائی۔ ان احمقوں کو کیا معلوم کہ کمزوری کسے کہتے ہیں اور قوت کسے کہتے ہیں۔ قائد اور لیاقت علی خان کی قیادت میں تو تقریباً نہتے کشمیریوں نے کشمیر کا کافی حصہ بزور بازو آزاد کروالیا تھا اور وہ حصہ اب بھی آزاد کشمیر کہلواتا ہے۔ ارے بھائی لیاقت علی خان نے تو خود پاکستان کو آزاد کروایا تھا۔ اس جیسے شخص کے خلاف آپ کے پیٹ میں کیوں درد اٹھا تھا کہ جن کا اس سارے معاملے میں کوئی کردار نہیں تھا۔ آپ تو اس وقت انگریز کی خدمت میں جتے ہوئے تھے اور مسلسل کہتے جارہے تھے کہ رائل انڈین آرمی ناقابل تقسیم ہے۔ اور اب یکدم یہ پینترا بدل لیا۔ بات اتنی سیدھی سادی نہیں۔ اس کے پیچھے پاکستان کی انقلاب مخالف قوتوں کا ہاتھ تھا۔ ان ہی لوگوں اور ان کے دوسرے بدبخت ساتھیوں نے آخرکار 1951ء میں خان لیاقت علی خان کو شہید کر ہی دیا اور پاکستان کو عدم استحکام کی راہ پر ڈال دیا۔ قائد کے سیاسی ساتھی تو ان کے تربیت یافتہ تھے اور انہیں تحریک پاکستان، عوامی جدوجہد اور اسلام کی قوت کا پوری طرح سے احساس اور ادراک تھا۔ مگر جو بیوروکریسی اور جرنیل شاہی ہمارے حصے میں آئی، ان کو آزادی کی تحریک کا شعور ہی نہیں تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک

نہیں ہے۔ ان کی سوچیں اور پیمانے وہی انگریزی غلامی کے فکر کی غماز تھیں۔

اس صورتحال میں انہیں انقلاب پاکستان کا دشمن نہیں بننا چاہئے تھا مگر وہ شعوری طور پر بنے یا غیر شعوری طور پر بنے، مگر بن گئے۔ ہم ان کی کم فہمی کی حقیقت سے آنکھ بند نہیں کر سکتے کہ ان کی خمیر ردانقلاب کے عنصر سے اٹھا تھا اور انہوں نے تو پہلے دن سے اس شاخ کو شیخ چلی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے، پاکستان بنا تو یہ فوج بھی بنی۔ پاکستان کو فوج نے نہیں بنایا اور بلکہ فوج کو پاکستان نے بنایا تھا مگر وہی لوگ یا انہی کے بند بے ضمیر ساتھ بانیان پاکستان کے درپے ہو گئے۔ ہمارے ٹیڑھے سفر کی یہ پہلی اینٹ ہے۔

اسی طرح وہ محدود نگاہ مولوی صاحبان جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ وہ پاکستان بن جانے پر جل بھن کر رہ گئے اور انہوں نے اپنے ذاتی مذموم مقاصد کی خاطر اسلام کا سیاسی استعمال شروع کر دیا۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے کلام تک کو ایک طعنے کے طور پر استعمال کیا اور پاکستان کی تمام دیواروں پر لما تقولون مالا تفعلون لکھ کر مسلم لیگ قیادت پر طعن تشنیع شروع کر دی کہ اب تم اسلام کو لاگو کیوں نہیں کر رہے۔ یہاں ان کا مقصد اسلام کا نفاذ نہیں تھا، صرف اور صرف مسلم لیگ کی قیادت کو خفت کا شکار انہیں شرمندہ کرنا درکار تھا۔ ایک لمحہ کیلئے سوچئے کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو بھارت کے ہندو راج میں یہ ملا اسلام نافذ کروا رہے ہوتے۔ یہ عقل کے عاری لوگ تو تخلیق پاکستان ہی کے خلاف تھے اور اسلام کی خدمت کی خاطر ہندو راج کے حق میں راہیں صاف کر رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ مسلم لیگ کی سیاسی جیت سے خار کھا کر اب اسے مذہبی تضاد کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں

نے ترویج وتبلیغ اسلام کا اصلی کام چھوڑ کر سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور بزعمِ خود اپنے آپ کو دینی سیاسی جماعت کہنا شروع کر دیا، جیسا کہ دوسری سیاسی جماعتیں از قسم مسلم لیگ غیر دینی جماعتیں تھیں۔ یہ ایک قسم کی سیاسی تکفیر کی ترکیب تھی۔ تبھی تو علامہ اقبال نے کہا تھا ''دینِ ملافی سبیل اللہ فساد'' اور ان لوگوں نے اس ''فساد فی سبیل اللہ'' کا آغاز 1948ء میں ہی شروع کر دیا تھا اور قائد کی رحلت کے فوراً بعد ہی ملا سیاست کا احیاء اور لیاقت علی خان کے قتل کی تیاری خالی از علت نہیں تھی۔

یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ یہ دونوں پاکستانی اسلامی انقلاب دشمن قوتیں اس وقت کے صاحب بصیرت مسلم لیگی زعماء کی موجودگی میں وقتی طور پر پنپ نہ سکیں مگر بعد میں یہی قوتیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی جڑوں میں بیٹھ گئیں۔ لیاقت علی خان اور ان کے ساتھ چونکہ صاحب بصیرت سیاستدان تھے اور ان کی سوچ کے اندر ایک لچک موجود تھی اور وہ خود بھی اسلام کے شیدائی تھے۔ اسلئے انہوں نے ان کم بختوں کے طعن وتشنیع سے درگذر کرتے ہوئے ان ہی سے کہا کہ دستور سازی کیلئے آگے بڑھیں اور پاکستان کے دستور کیلئے اسلام کے اساسی اصول مرتب کریں۔ سیاستدان آخر سیاستدان ہوتے ہیں، وہ بیوروکریٹس کی طرح عقل سے عاری اور ضد کے مارے نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان ہی علماء دین کو اس کام پہ لگا دیا جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے۔ تمام مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور ان علماء نے بھی اپنے 22 نکات پر مبنی ایک اسلامی دستور العمل پیش کر دیا جو بعد میں قرار دادِ مقاصد کی شکل میں دستور کا افتتاحیہ بنا۔ اس طرح خان لیاقت علی خان کی بصیرت نے پاکستان کو کسی مذہبی تضاد کا شکار ہونے سے بچا لیا اور ملک کے اندر فرقہ واریت کی وبا

کو بھی نہایت ہوشمندی سے روک لیا۔ مگر لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد اس مسئلے نے ایک دفعہ پھر سر اٹھالیا۔ کیونکہ پاکستان کے انقلاب کی مخالف قوتیں ایک دفعہ پھر سرگرمِ عمل ہو گئیں۔

ان ہی قوتوں نے لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں مسئلہ قادیانیت کو ابھارا اور معاملہ شہر لاہور میں مارشل لاء کے نفاذ تک پہنچ گیا۔ یہ مسئلہ تو قوت کیساتھ دب گیا مگر اپنے پیچھے اور بہت سے مسئلے کھڑے کر گیا۔ ایک تو اس تجربے سے فوج کے منہ کو مارشل لاء کا خون لگ گیا، جس نے آگے جا کر پاکستان کی فکری اساس کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا اور دوسرے پنجابی بنگالی کا بہت ہی ہولناک اور متعصبانہ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ چونکہ اس قضیئے کے نتیجے میں بنگالی وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے پنجابی وزیراعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کو برخواست کیا تھا، اسلئے ان دونوں کا جھگڑا بنگالی پنجابی چپقلش کی صورت اختیار کر گیا اور یوں پاکستان کی سیاست کے اندر صوبائیت اور علاقائیت کا خطرناک زہر پھیلنا شروع ہوا جس کیبعد میں بہت زیادہ خوفناک نتائج برآمد ہوئے۔

مگر ان سب سے بڑھ کر جس معاملے نے پاکستان کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں، وہ ہمارے اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کا امریکی سی آئی اے کے جھانسے میں آجانا ہے۔ ہوا یوں کہ 1952ء میں جنرل آئزن ہاور دوسری جنگ عظیم کا سپریم کمانڈر رہا تھا اور یورپ میں روس کی بے محابا وسعت اور چڑھائی کو دیکھ چکا تھا۔ اسی طرح وہ اس کے ایشیا، افریقہ کے پھیلاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ آئزن ہاور کے فوجی ذہن نے روس چین کے اردگرد ایک دفاعی حصار کھڑا کرنے کی سکیم تیار کی۔ اس مقصد

کیلیئے اسے یورپ کے علاوہ جہاں مغربی یورپ اس کے ساتھ نیٹو کے دفاعی معاہدے میں جکڑ رکھا تھا، ایشیاء میں روس کے پڑوسی ملکوں ترکی، عراق، ایران اور پاکستان سے دوستی اا ور فوجی معاہدوں کی ضرورت پڑی۔ بھارت کی دوستی روس کے ساتھ تھی۔ لہٰذا اسے پاکستان ایک فطری منطقی دوست نظر آیا مگر اس وقت کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین ایسے معاہدے کے اندر چھپے مضمرات کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اسلئے وہ ایسی کسی سکیم کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اپنے قریبی پڑوسیوں سے دور کی دوستیوں کے بدلے کوئی جھگڑا نہیں چاہتے تھے۔ وہ آزاد اور خوددار قائد اعظم کے مکتب کے فارغ التحصیل تھے اور وہ اپنی آزدی کسی کے ہاں رہن نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ آزاد اور خودمختار ملک کے وزیراعظم کی حیثیت سے اپنی خارجہ پالیسی بھی آزاد اور خودمختار رکھنا پسند کرتے تھے، مگر امریکہ کو اس سے کیا، وہ تو اپنا کھیل کھیلنا چاہتا تھا، لہٰذا انہوں نے اس وقت کے پاکستانی کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو جو کہ امریکہ سی آئی اے کے ڈائریکٹر جان ڈلس کا دوست تھا، اپنا ہم خیال بنالیا۔ جنرل ایوب خان کو ڈلس نے لالچ دیا کہ وہ اسکی فوج کو جدید ترین ہتھیار دیکر اسے مضبوط بنادیگا، لہٰذا وہ اس پیشکش کی تمامتر مضمرات اور قباحتوں کو سمجھے بغیر ان کے جھانسے میں آگیا۔ اسی طرح سی آئی اے نے ملک گلام محمد گورنر جنرل پاکستان کو، جو ایک ماہر معاشیات تھے، یہ جھانسہ دیا کہ وہ اسکے ملک کو معاشی امداد دیکر مالا مال کردینگے۔ کسی ماہر معاشیات کا ذہن اس سے آگے تھوڑا ہی سوچ سکتا ہے کہ اس طرح کی باتیں آخر کار آزادی کی نعمت کو چھین لیتی ہیں۔ ایک ماہر معاشیات کی محدود فکر میں آزادی کی اور کیا قیمت ہوتی ہے، اسکی قیمت تو کوئی سیاسی بالغ ذہن ہی پاسکتا تھا اور وہ ذہن خواجہ ناظم الدین کی صورت میں

موجود تھا مگر محدود نگاہ فوجی جرنیل ایوب خان اور لالچی ملک غلام محمد سے مل کر خواجہ صاحب کی چھٹی کروانے کی ٹھان لی۔ امریکی سی آئی اے کے کہنے پر جنرل ایوب خان نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت پر سمگلنگ کی روک تھام میں نااہلی کا الزام لگا کر کہا کہ اس طرح تو ملکی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور پھر خواجہ ناظم الدین کی منتخب حکومت کی گورنر جنرل یک قلم چھٹی کروائی۔ خواجہ صاحب کی برخاستگی ملکی سلامتی کے نام پر کی گئی اور امریکہ میں متعین پاکستان سفیر محمد علی بوگرا، جو کہ امریکیوں ہی کا پانی بھرتا تھا، کو محمد علی جناح کے ملک کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ وہ پاکستان کے عوام سے زیادہ امریکیوں کا خیر خواہ تھا۔ پھر کیا تھا کہ پاکستان فوراً بغداد پیکٹ میں شامل ہو گیا بلکہ سیٹو کا بھی، جو کہ جنوب مشرقی ایشیا کے امریکی وفادار ملکوں کا گٹھ جوڑ تھا، ممبر بن گیا۔ یوں پاکستان کی افواج کو امریکی ہتھیار اور ملک کو معاشی امداد تو مل گئی مگر اسکی آزادی گہنا گئی۔ ملک کے اندر سیاسی حکومت ختم ہو گئی اور ایک بیورو کریٹک انتظامیہ براجمان ہو گئی جس کے اندر اس وقت کا پاکستانی کمانڈر انچیف باقاعدہ وردی میں ملبوس کابینہ کا وزیر و فائع بن گیا۔ وہ دن اور آج کا دن پھر قائداعظمؒ کے جمہوری اور اسلامی پاکستان کو دوبارہ جمہوریت اور جمہور کی توانا آواز اور آزادی نہ مل سکی، قائداعظمؒ کے طفیل بنے کمانڈر انچیف اور بیورو کریسی نے مل کر خود قائداعظم کا ہتھوڑے مار مار کر پھوڑ ڈالا۔ ان عقل کے اندھوں کو کیا معلوم کہ آزادی اور جمہور کی آواز کسے کہتے ہیں۔ وہ جمہور جس کی قوت نے پاکستان کی تخلیق کا معجزہ بپا کر دکھایا تھا، وہ طاقت جس کے آگے انگریز اور ہندو دونوں ملکر ڈھیر ہو گئے تھے مگر اب وہ طاقت خود اپنوں ہی کے ہاتھوں ڈھیر ہو کر رہ گئی تھی۔ ہائے ان کوتاہ اندیشوں نے اپنی آزادی کی کیا قیمت لگائی۔ قوم

بیچ ڈالی اور بہت ہی سستی بیچ ڈالی۔

اس دن سے لے کر آج تک جب بھی امریکہ چاہتا ہے تو وہ اپنے مذموم مقاصد کی خاطر ہماری ہی فوجی قوت کو ہمارے خلاف استعمال کرتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعہ اپنے من پسند ٹیکنوکریٹس کو اہم کلیدی جگہوں پر تعینات کروا کر اپنی مقصد براری کروالیتا ہے، پھر امریکہ کہ جب مرضی ہوتی ہے تو الاماشاء اللہ ہمارے عظیم دانشوروں کے ذریعہ ذہین وفطین ٹیکنوکریٹس کیلئے ایک آوازہ اٹھتا ہے اور وہ پھر ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے نہاں خانوں سے نکل کر پاکستان کو بچانے کیلئے پہنچ جاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایک خاص غلامانہ ذہنیت کی آبیاری بڑے اہتمام سے کی جاچکی ہے، جس کی وجہ سے قائداعظمؒ کے پاکستان کے اندر سیاست یا جمہوریت ایک عظیم گناہ کی شکل اختیار کرچکی ہے اور غیر جمہوری انتظامیہ امرت دھارا بن چکی ہے۔ اس قابلِ نفریں ذہنیت کی آبیاری کیسے ہوئی؟ یہ بذات خود ایک تکلیف دہ اور افسوس ناک دستان ہے سننے کی اور نہ سنانے کی۔

قوم فروشی کے اس سارے کھیل میں اب جنرل ایوب خان کے منہ کو اقتدار کا خون لگ چکا تھا۔ وہ قائد کے قوم کو دیئے گئے اصول ڈسپلن کو بھول چکا تھا۔ وقت آنے پر اس نے ایمان اور اتحاد کے اصولوں کی بھی قربانی دینی تھی۔ 1954ء کے اس واقعہ کے بعد پاکستان کے اندر اب تمام حکومتیں بیرک کے اشارے پر بدلنا شروع ہوگئیں اور پاکستان "ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں" کی عملی صورت اختیار کرگیا۔ غلام محمد کے بعد جنرل ایوب خان کو ایک اور شاطر پیٹی بند بھائی جنرل سکندر مرزا مل گیا اور حکومتی تبدیلیوں کا یہ کھیل اور بھی زیادہ تیز ہوگیا بلکہ کردیا گیا تاکہ

بوقت ضرورت آمریت کیلئے بہترین جواز بن سکے ۔ سازشی ذہن اپنی ذات کیلئے ہمیشہ بہت تیز ہوتا ہے اور بہت دور کی سوچ لیتا ہے۔

مگر ابھی تک بھی سیاسی افق پر کچھ لوگ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تربیت کے پختہ کار موجود تھے۔ان میں سے دو نام بہت ہی قابلِ قدر ہیں: ایک تھے چوہدری محمد علی مرحوم اور دوسرا اسمِ گرامی ہے حسین شہید سہروردی کا۔ان دونوں کا کاوش سے قائداعظم کے پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری اور فلاحی دستور 1956ء میں مل گیا جس پر تمام دینی مکاتبِ فکر اور سیاسی جماعتوں بشمول مشرقی پاکستان کا مکمل اتفاق رائے تھا۔ پاکستان کی مکمل آزادی کیلئے جس دستوری چٹان کی ضرورت تھی۔ وہ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے عین 16 سال بعد 23 مارچ 1956ء کو مل گئی اور پاکستان ملکہ برطانیہ کی رسمی غلامی سے نکل کر ایک اسلامی جمہوریہ بن گیا۔ پوری قوم نے اس وقت جشن منایا اور آئندہ کے انتخابات کیلئے تیار شروع کر دی۔ جنرل سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان نے جب دیکھا کہ اگر یہ الیکشن ہو گئے تو ان کا سیاسی شطرنج کا کھیل ختم ہو جائیگا۔لہٰذا جنرل ایوب خان ایک دفعہ پھر ان انتخابات کے مضر اثرات کی تفسیر بتانے امریکی سی آئی اے کے پاس پہنچ گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ انتخابات تو پاکستان کی سلامتی کیلئے زہرِ قاتل ثابت ہونگے۔ اسلئے کہ پاکستانی عوام تو بڑے خونخوار اور ظالم ہیں۔ وہ اکٹھے ہو جائیں تو انگریز کو باہر نکال پھینکتے ہیں۔ ان کے سامنے ہمارے جیسے پٹھوؤں کی کیا حیثیت ہے،لہٰذا الیکشن نہ ہی ہوں تو بہتر ہے، کچھ اور ہی ہو جائے کہ کھیل ہمارے ہاتھ میں رہے۔تفصیلات کے لیئے جنرل ایوب خان کی اپنی کتاب ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' جو انہوں نے امریکیوں کے

ساتھ ناراضگی کے بعد لکھی، کافی ہے مگر اب کتابیں لکھنے سے کیا فائدہ، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

جنرل ایوب خان اور جنرل سکندر مرزا کی اس ناپاک سازش کے تحت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے پاکستان میں جو اب ایک اسلامی جمہوریہ بھی بن چکا تھا، 7 اکتوبر 1958ء کو دستور ساقط کر کے مارشل لاء لگا دیا گیا۔ ملک کے تمام دستوری اور جمہوری ادارے ختم کر دیئے گئے۔ وہ تمام جمہوری ادارے جنہیں جمہور نے ہزاروں لاکھوں قربانیوں سے بنایا تھا، پہلے ملک بنایا اور پھر ادارے بنائے، بیوروکریسی بنائی اور فوج بنائی مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ان ہی رذیل بچوں نے اپنی جنم دینے والی ماں کو مار ڈالا۔ چند دنوں بعد ہی ان دونوں ناخلف بچوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور ایوب خان نے اپنے بڑے بھائی سکندر مرزا کو دیس نکالا دے دیا اور تن تنہا قائداعظمؒ کے ملک کا مالک بن بیٹھا۔ عوام کو بے دخل کر دیا اور انہیں اپنا ذاتی غلام بنا لیا اور خود غیروں کا غلام بن گیا بلکہ بہت پہلے بن چکا تھا۔ اس کے بعد کیا گل کھلنے والے تھے، وہ آخر کار کھل کر ہی رہے۔ محتاجی اور غلامی ہمارا مقدر ٹھہرا۔ رفعتوں کے بعد پستی کا یہ سفر بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ اس المیہ کو بیان کرنا اتنا آسان نہیں مگر معاملات کو سمجھنے اور ان کی اصلاح کیلئے کچھ نہ کچھ بیان کرنا ضروری ہے کہ کوئی سبق سیکھا جا سکے اور قائداعظمؒ کی کھوئی ہوئی میراث کو ایک دفعہ پھر واگزار کروایا جا سکے۔

بربادی کا سفر

جنرل ایوب خان کی چونکہ تحریک پاکستان سے کوئی شناسائی نہیں تھی، اسلئے اس نے جب ایک عارضی دستوری حکم نامہ جاری کیا تو اس میں سے اسلامی کا نام نکال دیا۔ وہ تو غیروں کے اشارے پر کام کر رہا تھا اور ان غیروں کو ابھی تک وہ ہزیمت نہیں بھولی تھی جو انہیں محمد علی جناحؒ کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی۔ جب اس نے پاکستان کی صورت میں ایک مسلم قومیت کی تشکیل دے دی تھی۔ حالانکہ چند سال ہی پہلے تو وہ سلطنت عثمانیہ کو اپنے تخیل کے تراشیدہ وطنیت کے فلسفہ کا شکار کر چکے تھے۔ وہ بدلہ اب انہوں نے جنرل ایوب خان کے ذریعہ لے لیا۔ اس جاہل جرنیل کو کیا معلوم کہ اس

نے یہ کتنے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

جنرل ایوب کی حرصِ اقتدار نے دوسرا گھاٹے کا سودا کشمیر کا کرلیا۔ دنیا نے جب دیکھا کہ خود پاکستان اپنی آزادی کھو بیٹھا ہے تو اب اسے کشمیر کی آزادی کی بات کرنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں رہ گیا۔ غلام پاکستان (ایوب خان کا غلام) کشمیر کی آزادی پر کیسے بات کرسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مارشل لاء کے بعد یواین او نے کشمیر پر ایک بھی قرارداد پاس نہیں کی، یواین او کی آخری واحد قرارداد 1957ء کی ہے۔ پھر یہ باب ہی بند ہوگیا۔ یہ سب کچھ ایوب خان کا کیا دھرا تھا، کیونکہ اب پاکستان کے اندر اصول کوئی طاقت نہیں رہ گئے تھے بلکہ طاقت ہی ایک اصول بن گیا تھا اور جب طاقت کے بل بوتے پر کچھ بن سکتا تھا جس وقت 1962ء میں چین نے بھارت پر حملہ کردیا تھا تو جنرل ایوب خان کینیڈی کی ایک دھمکی کے آگے بھیگی بلی بن گیا۔ اصولوں کے بغیر طاقت ہمیشہ کھوکھلی ہی ہوتی ہے۔ حالانکہ ہمارا دوست چین اسوقت ہماری طرف دیکھ رہا تھا کہ ہم کشمیر پر حملہ کرکے اپنا کام بھی کرلیں اور کچھ اس کا ہاتھ بھی بٹائیں مگر دسترکش احساسِ گناہ سے لدے جرنیل کو یہ جرات کیسے ہوسکتی تھی۔ اس کیلئے تو کسی محمد علی جناحؒ کا دل گردہ درکار تھا کہ 1947ء میں نہتے بھی کچھ نہ کچھ کر بیٹھے تھے جو آج بھی ہمارے ساتھ ہے اور آزاد کشمیر کہلواتا ہے مگر ایوب خان پیشاب کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

حد تو یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت پر قبضہ کرلینے کے بعد یہ تحریک پاکستان کے جذبوں سے ناآشنا جرنیل دلی جاکر جواہر لعل نہرو کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کردیتا ہے کہ یہ اسکے آقا امریکہ کی خواہش تھی تاکہ جواہر لعل نہرو بھی قائداعظمؒ کے دو قومی

نظریہ کے اختتام کا اشارہ دیکھتے ہی لالچ میں آ کر شاید روس کیخلاف کھڑا ہونے کو تیار ہو جائے اور امریکہ کے کھیل کا حصہ بن جائے۔ مگر جواہر لعل نہرو روس کی ناراضگی کیلئے تیار نہیں تھا اور اس نے مشترکہ دفاع کی تجویز یہ کہہ کر رد کردی کہ مشترکہ دفاع کس کیخلاف؟ شکر ہے کہ جواہر لعل نہرو نے یہ کہہ دیا، وگرنہ جنرل ایوب خان تو دو قومی نظریہ کا ہی سودا کر بیٹھا تھا۔ پھر سرحد کہاں رہ جاتی اور قائداعظمؒ کا پاکستان کدھر جاتا؟ مگر مشیت ایزدی کو اپنی تخلیق کی بربادی منظور نہیں تھی اور پاکستان بچ گیا۔ ذرا غور فرمایئے جنرل صاحب کی سادگی یا سازش کا کہ قائداعظمؒ تو ایک رسمی عہدہ گورنر جنرل کیلئے مشترکہ کا لفظ سننے کیلئے تیار نہیں تھے اور جنرل ایوب خان بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع کی بات کر رہے تھے۔ تاریخ سے بے بہرہ لوگ ہمیشہ خلافِ تاریخ ہی بات کرتے ہیں اور پھر تاریخ ان سے بدلہ ضرور لے لیتی ہے۔

جھوٹے لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہی چونکہ جھوٹ ہوتا ہے، اس لئے اب راست گو قائداعظم کے پاکستان کے اندر جھوٹ کو رائج الوقت سکہ قرار دیا گیا۔ جنرل ایوب خان نے قائداعظم کے تمام ساتھیوں پر یک مشت بددیانتی اور خیانت کے الزامات تھوپنا شروع کر دیئے اور انہیں سیاست سے باہر نکالنے لئے ایبڈو کا قانون نافذ کر دیا۔ یہ سب کچھ ان پارسا اور عظیم لوگوں کی کردار کشی کیلئے کیا جا رہا تھا تا کہ وہ اس غاصب کی پرسش نہ کر سکیں۔ اس جھوٹے ایوب خان نے بانیانِ پاکستان اور عوام کو پاکستان کی سیاست سے باہر نکال پھینکا۔ کیا خوب کام کیا چند ملازم پیشہ لوگوں نے مل کر۔ قائداعظمؒ کے ملک کے اصل مالکان کو بندوق کی نوک پر جھوٹے الزامات لگا کر انکے اپنے گھر سے بیدخل کر دیا۔ یہ الزامات سہروردی پر لگے، یہ الزامات چوہدری محمد

علی پر لگے۔ یہ الزامات چوہدری محمد حسین چٹھہ اور میاں ممتاز دولتانہ پر لگے، یہ الزامات خواجہ ناظم ادین پر لگے اور اسی طرح کے الزامات قائداعظمؒ کے تمام ساتھیوں پر لگے یعنی چند چوروں نے مل کر تمام شرفاء کو چور قرار دیدیا۔ عجیب تماشا تھا دن کو رات بنادیا اور رات کو دن بناڈالا۔ اسے کہتے ہیں کہ کرشمہ ابلیس کہ آخر اس نے بھی تو کچھ کام کرنا ہوتا ہے۔

قائد کے سیاسی ساتھیوں ہی کو معتوب نہیں کیا گیا بلکہ وہ تمام اعلیٰ سروسز کے ممبران، جنہوں نے آزادی ملنے پر پاکستان کی بنیادیں استوار کرنے اور مستحکم کرنے کیلئے دن رات ایک کردیا تھا۔ ان پر بھی بددیانتی کے الزامات لگے اور انہیں باہر نکال پھینکا گیا۔ ان میں ظفرالاحسن اور اے ٹی نقوی جیسے نابغہ روزگار سی ایس پی افسر بھی تھے جنہوں نے مہاجروں کو آباد کرنے اور سنبھالنے کیلئے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا۔ پاکستان کے استحکام کیلئے دارالحکومت بنایا۔ تھل کے صحرامہینوں اور دنوں میں آباد کردیئے اور پی آئی اے جیسی قومی ایئرلائن بے سروسامانی کے باوجود منظم کردی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے گلبرگ اور سمن آباد جیسی بستیاں بسائیں اور دریاؤں کے منہ موڑ کر صحراؤں کو گلستان بنادیا تھا۔ مگر اس سے ایوب خان کو کیا۔ اسے تو اپنی غاصب حکومت کا سچا جھوٹا جواز چاہیئے تھا اور لوگوں کو ڈرادھمکا کران پر رعب ودبدبہ بٹھانا درکا رتھا۔ سو وہ اس نے ان قبیح حرکات سے حاصل کرلیا۔ مگر اس سارے عمل میں قائداعظم کے پاکستان کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی جڑیں ہلاکر رکھ دیں۔ سول سروس کے یہ لوگ اور سیاسی زعماء جو ایوب خان کے عتاب کا شکار بنے۔ ان پر آج تک ایک پائی کی خیانت ثابت نہیں ہوسکی مگر ایک آمر کو ان عظیم بانیانِ پاکستان کی روسیاہی کی ذاتی

اقتدار کی قربان گاہ کیلئے ضرورت تھی، وہ اس نے حاصل کر لی۔ مگر پاکستان کو اس کی عدم استحکام اور اخلاق باختگی کی شکل میں کیا قیمت ادا کرنی پڑی، ایک ڈکٹیٹر کو اس سے کیا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ بعد میں بہت عرصہ بعد معلوم ہوا کہ اس آمر سے زیادہ بے ایمان حکمران شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری نسل کے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ کرپشن اور کرپشن کی لفظی ترکیب معروف ہی ایوبی دور میں ہوتی ہے۔ ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کرپشن ایجاد ہی ایوب خان نے کی ہے۔ اس سے قبل کے لوگ بہت دیانتدار تھے، وہ تو بے چارے اپنی جائیدادیں اور زمینیں بیچ کر سیاست کرتے تھے۔ رشوتوں اور کمیشنوں کے تمام حربے سب بعد کی ایجاد ہیں، ایوبی دور کی ایجاد ہیں۔ جو اسکے جانشینوں کے زمانے میں مزید مضبوط صورت اختیار کرتے گئے۔ ہائے رے جھوٹ تیری کیا بات ہے۔ عظیم راست گو قائد کے ملک میں جھوٹ کا یہ گندہ اور ناپاک چلن۔

مجھے چونکہ ایوب خان کے دور سے لیکر اب تک کے تمام مارشلاؤں اور فوجی حکمرانوں اور ان کے سویلین چیلوں کے ساتھ کافی قریب سے کام کرنے کا موقع ملا ہے تو میں ہمیشہ حیران ہوتا رہا کہ یہ لوگ اتنی ہی خوبصورتی اور اہتمام سے کس طرح جھوٹ کو روا رکھ کر اپنا کام نکالتے ہیں۔ یہ عقدہ کشائی بہت بعد میں ہوئی، جب ایک بہت ہی نیک سیرت میرے دوست جرنیل نے مجھے سمجھایا کہ یہ بات ان کی پیشہ وارانہ ٹریننگ کا حصہ ہے۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا، تو فرماتے ہیں حیرات ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بات بالکل صاف ہے، ہم لوگ سٹریٹجی کے تحت دشمن کو دھوکہ دینے کے ماہر ہیں اور دھوکہ دہی کیلئے جھوٹ ضروری ہوتا ہے۔ توجہ ہٹانے کے لئے گولی کہیں اور

چلائی جاتی ہے اور اصل معرکہ کہیں اور ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ہم لوگ اندرون ملک نظم و نسق سنبھالتے ہیں تو اسی بنیادی حکمت عملی کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام کو دشمن سمجھ کر ان کے ساتھ کھیل کھیلتے ہیں۔ ناجائز کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دستور کشی کو خدمت ملک و ملت قرار دیتے ہیں اور بد دیانتی کو امانت کہتے ہیں۔ تب مجھے سمجھ آئی کہ یہ بازی گر کیا کیا کرتب دکھاتے ہیں اور یہ کرتب دنیا کے راست گو ترین سیاست دان حضرت قائد اعظمؒ کے ملک میں ایک بار نہیں، بار بار دکھایا جا چکا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

لوگ جب مارشل لاء وغیرہ سے تنگ آ جاتے ہیں تو اسکے سیاسی مضمرات پر اکثر بات ختم ہو جاتی ہے مگر کوئی دانشور ان قبیح حرکات کے سماجی اور اخلاقی اثرات کا کبھی تجزیہ نہیں کرتا کہ ہمارے معاشرے میں ان مارشل لاؤں نے اخلاق باختگی اور کذب گوئی کی کتنی آبیاری اور پرداخت کر کے ایک اسلامی معاشرہ کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ قانون کی حکمرانی کا تصور تک بگاڑ دیا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں جھوٹ اور افتراء کو چلن دیا ہے۔ سروسز کی قانون پسندی تباہ کر کے اسے اخلاقی پستی کا نمونہ بنا کر ایک ظلم عظیم کی مشین بنا کر رکھ دیا ہے اور ایک نہایت ہی پر امن اور مہذب معاشرہ کو تشدد اور جرم کا خوگر بنا دیا۔ یہ غمناک کہانی ایوبی مارشل لاء کے ساتھ شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ کوئی نہیں جو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہو اور تجزیہ کر کے سوچتا ہو کہ ہم نے اس سے کیا کچھ کھو دیا ہے۔ رونا سب روتے ہیں، الزام بھی سب پر دھرتے ہیں، مگر

سچائیوں کا سامنا کرنے کی جرات کم ہی دیکھی گئی ہے، بلکہ ایشوز کو زیر قالین دھکیلنے کا رجحان عام ہے۔

جھوٹ کے پرستار ہمیشہ جھوٹ ہی کے بت تراشتے ہیں اور یہ زمانے کا ہمیشہ سے چلن رہا ہے۔ ایوب خان نے ایک جھوٹا بت تراشا کہ وہ پاکستان کی معیشت کو بہتر کر کے ملک کو تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن کریگا اور اپنے ذاتی اقتدار کے تسلسل کو استحکام کا نام دیکر غیروں اے امداد اور قرض لینے کا نام ترقی رکھ لیا۔ اس ظالم کو کیا معلوم کہ اسے ترقی نہیں تباہی کہتے ہیں مگر اسے اس سے کیا، اسے تو اپنی ذاتی کام چلانا تھا۔ اس نے اس مقصد کیلئے اپنی آزادی کا سودا کر لیا اور ملک کو رہن رکھ کر امدادوں اور ادھاروں کی جھوٹی معیشت کی طرح ڈالی۔ چوہدری محمد علی جیسے اہل نظر نے اسوقت ہی کہہ دیا تھا کہ جناب جنرل صاحب یہ کام نہ کریں، ہم وہ وقت دیکھ رہے ہیں جب ہمیں ان قرضوں کا اصل نہیں بلکہ صرف سود اتارنے کے لئے مزید ادھار لینے پڑینگے اور اسوقت ہم دوسروں کے محتاج ہونگے۔ پھر ہماری آزادی ہوگی اور نہ ہی خودمختاری اور جو بین الاقوامی ساہوکار کہیں گے، وہ ہمیں ماننا پڑیگا اور یہ ذلت ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہر پاکستانی حکمران چاہے وہ سیاسی ہو یا فوجی، اسے امریکہ، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سے بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ اس ایوبی ترقی کے فریب نے ہمیں اب اس مقام پر پہنچادیا ہے کہ ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' والی کیفیت موجود ہے۔ ہم جان کنی اور نزع کے عالم میں ہیں اور پکار رہے ہیں کہ To be or not to be اور یہ سب کچھ ایک جاہل جرنیل کا کیا دھرا ہے۔ جس نے نام نہاد ترقی کا دس سالہ جشن منا کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی اور یہ قائد کے ملک کے

ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے جو ایک پائی تک کا کسی غیر سے روادار نہیں تھا۔ اسے بھی معاشی بدحالی سے بہت ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گئی تھی مگر اس نے اپنی آزادی اور عزت کا سودا کبھی نہیں کیا۔ اس نے عوام کو کبھی جھوٹ پر مبنی سہانے خواب نہیں دکھائے۔ وہ تو سچ کا بندہ تھا۔ وہ تو صاف صاف کہتا تھا کہ ہم سب کو قربانی دینا پڑیگی، تکلیفیں اٹھانا پڑینگی۔ اس نے تو کبھی کسی جھوٹی جنت کی تصویر کشی نہیں کی تھی مگر جنرل ایوب خان تو حسن بن صباح والی جھوٹی جنت دکھا کر ہمارے مستقبل کے معاشی قتل کا اہتمام کر رہا تھا اور اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا بلکہ زرخرید دانشور اسکے قصیدے پڑھ رہے تھے۔

جنرل ایوب خان نے اسی نہج پر زندگی کے ہر شعبہ میں جھوٹ کا چلن جاری رکھا مگر کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، آخر کار اسے پکڑے جانا ہوتا ہے۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد اس ملک کے اصل مالکان نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ تو ہاتھ ہو گیا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اس جھوٹ کے پردے چاک کرنے لگ گئے۔ سہروردی ہو یا خواجہ ناظم الدین، ولی خان ہو یا مولانا مودودیؒ، چوہدری محمد علی ہو یا دولتانہ، مجیب الرحمان ہو یا بھاشانی۔ سب نے ملکر اس جھوٹ کے پلندے سے چھٹکارے کا سوچنا شروع کر دیا اور اس کام کیلئے انہیں بانی پاکستان کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کا سہارا لینا پڑا۔ اس عظیم انسان کی عظیم بہن نے اس جھوٹ کے پلندے کو سیاسی میدان میں للکار دیا۔ اب کیا تھا کہ سارا پاکستان ایک طرف تھا اور جنرل ایوب خان اور اسکے پٹھو دوسری طرف کھڑے تھے۔ 65-1964ء کے الیکشن میں مس فاطمہ جناح نے جنرل ایوب کا مقابلہ کر کے اس کے سیاسی بادبانوں میں سے ہوا نکال

دی تھی مگر ایوب خان انتظامی دھونس دھاندلی سے رسمی طور پر صدارت کا الیکشن جیت گیا مگر جو اصلیت تھی، اس کا اسے بھی پتہ تھا اور عوام کو بھی پتہ تھا۔ اب کسی اور ڈرامے کی ضرورت تھی اور وہ جنرل ایوب خان کے ذہن رسا نے کشمیر پر رچانے کا فیصلہ کیا اور مجاہدین کو مقبوضہ کشمیر کے اندر بھیج کر عوامی توجہ کو اپنی سیاسی شکست اور شاطرانہ جیت سے ہٹانے کی کوشش میں ڈٹ گیا۔ اس ڈرامے سے اندرون ملک بے چین عوام کی توجہ واقعی ہٹ گئی تھی۔ مگر اس کیلئے ہمیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ میں تفصیلات میں نہیں جاتا۔ تفصیلات کیلئے الطاف گوہر صاحب کی کتاب ایوب خان دیکھ لیجئے۔ اس ڈرامے کی وجہ سے آخر کار پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کی نوبت آگئی اور اس غیر ضروری جنگ کے جو خراب نتائج نکلے، اس کی سزا ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ اور تو اور، اس بے سوچی سمجھی مہم جوئی نے مسلمانوں کی ہزار سالہ فوجی اور شمشیر زنی کی دھاک کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ دیکھا ایک بے بصر اور اقتدار کے حریص انسان نے کس طرح اپنے ملک اور اپنی ہی فوج کو اپنے ذاتی مقاصد کی خاطر داؤ پر لگا دیا۔ اسے کہتے ہیں کلاسیک بے بصیرتی۔ رہ بات حب الوطنی کی! ہائے سب گریبان چاک چاک ہیں۔

اس غیر ضروری مہم جوئی نے جہاں ملک کو اور بہت سے نقصانات سے پہنچائے، وہاں ہمارے مشرقی پاکستان کے بھائیوں کو شدید عدم تحفظ کا شکار کر دیا۔ کیونکہ ایوب خان کا دفاعی نظریہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کے مضبوط دفاعی اور خارجہ حکمت عملی کے وسیلہ سے کیا جائیگا مگر یہ نظریہ اصل جنگ میں دھرے کا دھرا رہ گیا اور مشرقی پاکستان بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی بچت چین

کی بروقت دھمکی سے ممکن ہوئی وگرنہ فوجی اعتبار سے معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ نعرہ مغربی پاکستان کی حد تک بھی کھوکھلا اور ڈھیلا تھا۔ اس وجہ سے ہمارے بنگالی بھائیوں کے دل میں طرح طرح کے خدشات نے جنم لینا شروع کردیا، جس کا آخرکار نتیجہ بہت تکلیف دہ اور بھیانک نکلا۔ معاہدہ تاشقند کی ذلت نے ہمارا بھرم بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیا۔

1965ء ہماری تاریخ کا ایک عجیب وغریب سال ہے، اس سال میں قائداعظمؒ کے جمہوری پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کیلئے ان کی اپنی بہن کی قیادت میں آخری کوشش ہوئی، جسے ایک جھوٹے مارشل نے دھاندلی کے ہتھکنڈوں سے ناکام کر کے عوام اور سیاستدانوں میں مایوسی کو انتہا تک پہنچادیا۔ اس کے بعد تو پھر فاشزم کی باری رہ گئی تھی، مارشل لائی فاشزم نے عوامی فاشزم کو جنم دینا ہی تھا مگر اس سفر کے لئے آخری حد 1965ء کی جنگ اور اسکے بعد تاشقند کے اعلان نے کراس کر دی۔۔۔اس کے بعد مارشل لاء کے بھوت کی کوکھ سے وہ فاشسٹ نظریئے پیدا ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں لسانی بنیاد پر عوامی لیگ نے بنگلہ دیش کا لبادہ پہن لیا اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے روٹی، کپڑا اور مکان کے نام پر اسلامی سوشلزم کی چادر اوڑھ لی۔ اس طرح جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے ردعمل سے عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے نظریوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے مسلم قومیت کے نظریئے کو اسی کے ملک سے دیس نکالا دیدیا۔ ان جھوٹے نظریوں کے سامنے اسلامی فلسفہ اور کلچر پر مبنی مسلم قومیت کا نظریہ دب کر رہ گیا اور اس کے نام لیوا جنہیں ایوبی مارشل لائی تلوار پہلے ہی کمزور کر چکی تھی، ایک بند گلی میں دھکیل دیئے

گئے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر کراچی کے مدفن میں محمد علی جناح کی روح تڑپی تو بہت ہوگی کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں کہ سر پر چڑھ کر ہتھوڑا مارنا۔ جسے ایک بے بصر جرنیل کی کرتوتوں نے موقع فراہم کیا۔ جس کی وجہ سے قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا اور وہ غلط راہوں پر چل نکلا۔ اب انجام کیسے اچھا ہوسکتا تھا، برے کاموں کے نتیجے ہمیشہ برے ہی نکلتے ہیں۔

یہ ایوبی دور ہی تھا جس انتظامیہ خاص طور پر پولیس کو ایوب خان کے سیاسی مخالفین کے خلاف بے دریغ استعمال کیا گیا۔ اور سیاست دانوں پر انتہائی بیہودہ، مضحکہ خیز اور بھونڈے الزامات لگائے گئے۔ مغربی پاکستان مین صوبے کا سربراہ ایک نہایتی سفاک اور ظالم شخص امیر محمد خان نواب آف کالاباغ مامور ہوا اور مشرقی پاکستان میں منعم خان گورنر متعین تھا۔ ان دونوں نے ملکر مخافین کیخلاف جھوٹے فوجداری مقدمات قائم کرنے کی بری ریت ڈالی اور اس مقصد کیلئے ہر جگہ کے مقامی غنڈوں اور بدمعاشوں کو استعمال کیا گیا۔ اس بدمعاشی سے اب کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ آپ حیران ہونگے کہ ملک کے معروف درویش منش شاعر حبیب جالبؔ کو اقدام قتل کے جھوٹے مقدمے میں ملزم بنا کر اسلئے گرفتار کرلیا گیا کہ اس نے ایوب خان کے دیئے گئے دستور کو اپنی مشہور نظم میں بے نور کیوں کہہ دیا تھا۔ وہ دستور واقعی بے نور تھا کہ اس میں سے لفظ اسلامی کا نام ہی غائب تھا۔ اب قائداعظمؒ کا پاکستان اسلامی جمہوریہ سے صرف جمہوریہ رہ گیا تھا۔ گو جالب کا مقصد یہ نہیں تھا مگر اس نے بہر صورت اسے بے نور کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حبیب جاب کے خلاف مدعی کون تھا؟ مدعی کرشن نگر لاہور کا مشہور بدمعاش اور قاتل بابو وارث تھا۔ کیوں نہ ہوتا بابو وارث

نے مقدمہ درج کرایا تھا کہ حبیب جالب نے مجھ پر خنجر سے حملہ کیا تھا۔ جب ملک کے بنیادی قانون و آئین کو توڑنے والا بدترین جرم کا مجرم ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے اور صوبے کا سب سے بڑا غنڈہ کالا باغ گورنر بن سکتا ہے تو پھر بابو وارث کیوں نہ حبیب جالب کے خلاف فریادی بنتا۔ یہ کہانی ملک کے ہر شہر اور گاؤں کی تھی کہ ہر جگہ کا غنڈہ اور بدمعاش اب وہاں کو چوہدری تھا، بی ڈی کا ممبر تھا اور پاکستان، پاک لوگوں کی جگہ خدا کی بستی کا چپہ چپہ بدمعاشوں اور قاتلوں کے قبضہ میں تھا۔ جہاں برائی اترا رہی تھی اور نیکی شرما رہی تھی۔ مجرم سازی عام تھی اور انسانیت سازی غائب تھی۔ اور آہستہ آہستہ پاکستان مسائلستان اور مجرمستان بنتا جا رہا تھا کہ ایک فوجی جرنیل نے قومی ہتھیاروں کا سہارا لیکر پاکستانی شہریوں کی محبتوں اور قربانیوں کا مذاق اڑایا تھا اور ایک نہایت ہی پر امن اور مہذب معاشے کو جرم کا کوگر بنا دیا تھا۔ قانون اور قانون کی حکمرانی کو دیس نکالا دیدیا گیا۔ دستور و آئین مزاق بن کر رہ گئے اور قانون و تہذیب کی ہر علامت ڈھیر ہوتی گئی۔ عدالتیں بے بس کر دی گئیں اور پولیس جو قانون کی قوت سمجھی جاتی تھی، وہ حکمرانوں کی ذاتی لونڈی بن گئی اور جمہوری دستوری جدوجہد پر مکمل ایمان رکھنے والے قائد اعظمؒ کے ملک میں لاقانونیت اور تشدد ہی وہاں کا دستور بن گیا۔ آئین شکنی سے برسر اقتدار آنیوالوں سے آپ اور توقع بھی کیا کر سکتے تھے۔ جب آئین شکن حکمران بنتے ہیں تو وہ دستوری حکومت ہی نہیں چھینتے، وہ لوگوں سے تہذیب اور شائستگی بھی چھین لیتے ہیں۔ وہ جرم ہی نہیں کرتے، بدترین اور بنیادی جرم بلکہ وہ مجرمانہ ذہنیت کی ایسی آبیاری کرتے ہیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد بھی وہ ذہنیت اس معاشرے کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دراصل جرم سے کہیں زیادہ وہ مجرمانہ

ذہنیت خطرناک ہوتی ہے اور اس ایوبی تحفے نے ایوب خان کے جانے کے بعد بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا اور یہ مجرمانہ ذہنیت ہر گذرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی گئی اور قائد اعظم کے پاکستان کو مجرمستان بنا کر رکھ دیا، مسلکی اور لسانی تشدد اسی کا شاخسانہ ہے کہ آج تک ہمارا حبس دم کررہی ہے۔ جہاں ہر لحظہ موت ارزاں ہے اور حیات پر خطر ہے، یہ سب ہمارے فوجی راجوں ہی کا کیا دھرا ہے۔

یہ اور بہت سے دوسرے خراب معاملات تھے جن کی وجہ سے آخرکار پاکستان کے عوام تنگ آ گئے اور تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اس ظالم آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ایوب خان کے تمام تیر و تفنگ اور تشدد کے ہتھکنڈے اسکے کام نہ آئے۔ اور عوام طاقت کے سامنے وہ ایک بھس بھرے شیر بلکہ گیدڑ کی طرح ڈھیر ہو گیا اور جاتے وقت اقتدار عوامی نمائندوں اور عوام کو واپس دینے کی بجائے کہ امانت کا یہی تقاضا تھا، ایک دوسرے جرنیل محمد یحیٰی خان کے حوالے کر گیا۔

اس سے کسی جمہوری یا شائستہ رویئے کی توقع عبث تھی۔ اسے جمہور اور جمہوری اداروں پر یقین ہی نہیں تھا۔ وگرنہ وہ قائداعظمؒ کے جمہوری اسلامی پاکستان پر اتنا گھناؤنا شب خون کیسے مار سکتا تھا۔ اس شب خون ہی نے تو اسے پورے پندرہ سال کیلئے 1954-69، ملک کے سیاہ وسپید کا مالک بنا دیا تھا، اب اس سے جمہوری روایات کی پاسداری عبث تھی۔ جیسے گندی نالی کا کیڑا صاف ستھری فضا میں زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح غیر جمہوری آمر کبھی بھی اپنی جانشینی کیلئے جمہور کو نہیں چن سکتا۔ وہ تو ایک دوسرے جرنیل ہی کے آنے میں عافیت دیکھ رہا تھا مگر اس وقت تک لوگوں کے

دل پھٹ چکے تھے اور ہر طرف کدورت ہی کدورت بھر چکی تھی۔ قائد اعظم کا خوبصورت خواب بے تعبیر ہو چکا تھا اور اب یہ خواب نازک آئینے کی طرح چکنا چور ہونے کو تیار تھا اور اگلے جنرل کے ہاتھوں اسے ٹوٹنا ہی ٹوٹنا تھا اور پھر وہ ٹوٹ گیا اور اس کی شکستگی کتنا گہرا گھاؤ لگا گئی۔ یہ صرف وہی لوگ جان سکتے تھے اور جانتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے خون سے سینچ کر بنایا تھا اور وہ جو اس وقت تک زندہ تھے یا زندہ در گور تھے کہ اسکی چوٹ محب وطن عوام کو آج تک نہیں بھولی۔ یہ تو وہ ذلت ناک چوٹ ہے جو قیامت تک نہیں بھلائی جا سکتی۔ مجھ میں یہ دردناک داستان سنانے کی سکت نہیں ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ بہت تکلیف دہ داستان ہے، میں نے اسے صدر ہاؤس میں بیٹھ کر رقم ہوتے دیکھا ہے کہ میں بدنصیب جنرل یحییٰ خان کا سکیورٹی افسر تھا اور بعد میں وہ میرا قیدی بھی رہا۔ میں اسے حمود الرحمان کمیشن کے سامنے پیش کرانے کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ میں نے کچھ روئیداد اپنی انگریزی کتاب the ultimate crime میں ضرور لکھ دی ہے مگر اب مجھ میں مزید تفصیل لکھنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ بہت ہی دردناک کہانی ہے اور اس المیہ کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی دو جرنیلوں ایوب خان اور یحییٰ خان پر عائد ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کیلئے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور پاکستان کے اصل مالکوں کو کچل کر رکھ دیا۔ پاکستان کو دو لخت کر دیا۔

ذلت کی انتہا

جنرل محمد یحیٰی خان نے تمام وہی کام کیئےجن کی رسم بد جنرل ایوب خان نے ڈال دی تھی۔ سروسز کے خلاف ہاتھ اٹھایا تو قدرت اللہ شہاب جیسے صاحب قلم اور درویش کو303 بد دیانتوں کی فہرست میں جاڈالا۔ کرپشن کیخلاف اسکے جہاد کا صرف اس ایک بات سے حساب لگالیں۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور دستور وقانون شکنوں سے آپ اور توقع بھی کیا رکھ سکتے ہیں۔ شراب وشباب کی محفلیں سجا کر اسلام کے نفاذ کی نوید سناتے رہے کہ شاید اسلام تمام گناہ کبیرہ کے اندر سے ابھرنا تھا۔ منافقت کی منقار میں اسلام بھی لے لیا اور جمہور کا درد بھی۔ ایجنسیوں نے تخمینے لگائے کہ انتخابات کیصورت مین ایسے نتائج برآمد ہونگے جس سے کوئی ایک

سیاسی جماعت بھرپور مینڈیٹ حاصل نہیں کر سکے گی اور پھر خالصہ راج کرتا رہے گا بلیوں کی لڑائی میں بندر راج کریگا مگر جب الیکشن ہوا تو مشرقی پاکستان کے عوام نے شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ کو ایک بھرپور مینڈیٹ دیدیا۔ ایسا میڈیٹ کہ وہ اکیلا ہی نیا دستور بنا سکتا تھا۔ حکومت سازی کا حق تو خیر سیدھی بات تھی۔ ادھر مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی ایک بہت بڑی سیاسی طاقت بن کر ابھری۔ دستور ساز اسمبلی کے تین سو کے ایوان میں عوامی لیگ نے 161 نشستیں حاصل کیں اور پیپلز پارٹی نے 82 سیٹیں لیں۔ مگر اس میں خاص بات یہ ہوئی کہ عوامی لیگ کی تمام سیٹیں مشرقی پاکستان سے تھیں اور پیپلز پارٹی کی مغربی پاکستان سے تھیں۔ یوں دونوں بازوؤں میں کوئی سیاسی رشتہ قائم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صورتحال اعلیٰ بصیرت اور تدبر کی متقاضی تھی مگر ایک جنرل عمومی چالبازیوں سے زیادہ اور بہت دور آگے سوچنے کی صلاحیت سے محرومی کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ اس وقت تو ایک رہبر کی ضرورت تھی۔ جس کی پیدائش و برداخت کے سوتے ایوبی آمریت نے خشک کر کے رکھ دیئے تھے۔ جنرل یحییٰ خان کو مجیب الرحمان اور بھٹو کو آپس میں لڑانے کی ترکیب سوجھی۔ الیکشن دسمبر 1970ء میں منعقد ہوئے مگر اسمبلی کا اجلاس بلانے کی تاریخ 3 مارچ 1971ء دی کیونکہ اس دوران ایک کھچڑی پکانی درکار تھی اور کھچڑی میں ہڈی ڈالنا بھی ضروری تھا اور وہ ہڈی بھٹو کے ساتھ مجیب الرحمان کے اشتراک اقتدار کا فارمولا تھا کہ اس طرح اسٹیبلشمنٹ کے مفادات کا تحفظ ہو سکے اور خود جنرل یحییٰ خان ایک طاقتور صدر کیطور پر قائم و دائم رہے۔ کباب میں اس ہڈی نے ایسا رنگ دکھانا ہی دکھانا تھا۔ قائداعظم کے پاکستان کا قومی تو کہتا ہے کہ پاک سرزمین کا نظام قوت اخوت عوام مگر

یہاں عوام اور اسکے نمائندوں کو کہا جاتا ہے کہ کچھ قوت اور اخوت ہماری بھی ساتھ شامل کرلیں۔ اب تو جھگڑا ہونا ہی تھا۔ دراصل یہ ج ھگڑا کروایا گیا اور اس جھگڑا کا باقاعدہ ایک منصوبہ تیار ہوا، اسلئے نہیں کہ اس جھگڑے میں ملک وملت کا کوئی فائدہ تھا، بلکہ اسلئے کہ اس جھگڑے میں ایک مفاد پرست حکمران ٹولیکا مفاد تھا۔ عوام نے تو اپنا فیصلہ بالکل صاف صاف دیدیا تھا کہ حق حکمرانی عوامی لیگ اور اسکے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو ہے مگر مفاد پرستوں نے کہا کہ اس میں ہمارا بھی تو حصہ ہے اور اس کام کیلئے ایک عجیب وغریب قسم کا ناٹک رچایا گیا۔ پہلے تو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس دیر سے بلایا اور پھر اس کے التواء کے مطالبہ ذوالفقار علی بھٹو سے کروایا گیا اور پھر وہ اجلاس عین آخری وقت پر یکم مارچ 1971ء کو غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔ جس کا مشرقی پاکستان میں شدید ردعمل ہوا اور پورا مشرقی پاکستان ساقط ہو کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ ایک نہایت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسی طرح کے ردعمل کیلئے ایک طے شدہ حکمت عملی کے تحت کروایا گیا تھا۔ ماہرین سٹریٹجی سے آپ اور کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

اس حماقت یا حکمرانوں کیلئے حکمت کے تحت پھر جنرل صاحب گفت وشنید کیلئے ڈھاکہ روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں کراچی رکتے ہیں اور اپنے خاص دوست قیوم مسلم لیگ کے ایم این اے اور ٹھٹھہ کے بہت بڑے وڈیرے محمد یوسف چانڈیو کی دعوت پر مرغابی کا شکار کھیلتے ہیں۔ دوران شکار ایک نہایت ہی پرتکلف ناشتے اور شراب کے جرعوں کے دوران ایک گفتگو سنئے اور تاریخ کے تلخ حقائق سے روشناس ہو جایئے:

یوسف چانڈیو: سائیں ایک طرف سے کتا آگیا ہے اور دوسری طرف سے سئور آگیا

ہے، اب آپ کیا کرینگے؟

جنرل یحییٰ خان: بچو دیکھنا میں ایسا دانہ پھینکوں گا کہ کتا سور کو کھا جائے گا یا پھر سور کتے کو چیر پھاڑ دے گا۔

دیکھا جنرل یحییٰ خان کتنی خطرناک گیم کھیل رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پاکستان اس جنرل کی نگاہ میں سور کتے کے کھیل کے میدان سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پاکستان جو اقبالؒ کی نگاہ میں خدا کی بستی تھی اور عامۃ المسلمین کی منزل مقصود قائداعظم محمد علی جناحؒ کا شاہکار جسے اسلام کی تجربہ گاہ اور عوام کی امنگوں کی آماجگاہ بننا تھا۔ ایک شرابی جرنیل کی نگاہ میں اسکی حیثیت کتے سور کے کھیل کے میدان کی بن کر رہ گئی۔ ہائے رے حرص تیری بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ شاید ایسے ہی موقع کیلئے اقبالؒ کہہ گیا تھا کہ کرگس کا جہاں اور ہے اور شاہین کا جہاں اور .... گو دونوں کی اڑان ایک ہی فضا میں ہے۔

اس قبیح حکمت عملی کے تحت بات آگے بڑھتی گئی۔ بھٹو صاحب بھی ڈھاکہ پہنچ گئے۔ دوسرے زعماء بھی بلا لئے گئے۔ مگر یہ سب کچھ ایک کیموفلاج تھا۔ اصل تیاری آرمی ایکشن کیلئے ہو رہی تھی۔ جنرل یعقوب کی جگہ جنرل ٹکا خان پہنچ چکے تھے اور افواج کی کمک مغربی پاکستان سے دھڑا دھڑ پہنچ رہی تھی اور 25 مارچ کو یک آرمی ایکشن شروع کر دیا گیا۔ عوام کے فیصلہ کو یک قلم مفلوج کر دیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمان گرفتار کر لئے گئے اور ان کے بہت سے ساتھ سرحد پار انڈیا بھاگ گئے۔ گولیوں سے عوام کو چھلنی کر دیا گیا اور پھر بھٹو صاحب نے کہا:

"شکر ہے پاکستان بچ گیا۔"

حالانکہ اہلِ نظر اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ اب قائداعظم کے پاکستان کی خیر نہیں۔ وہ تو اس فوجی لٹھ سے ٹوٹ چکا ہے۔ اہلِ بصیرت اس وقت بھی اس گھناؤنے کھیل کو سمجھ رہے تھے جب بھٹو نے ادھر تم اور ادھر ہم کا نعرہ بلند کیا تھا کہ تقسیم پاکستان کی تیاری ہے۔ افہام و تفہیم سے حکومت سازی کے معاملے طے کرنا اور بات ہے مگر یہاں تو بھدے انداز میں اور مار کٹائی سے پاکستان کو دولخت کرنے کا جال بچھایا جارہا تھا جس میں جنرل یحییٰ اور جنرل ایوب کے مکتب کا فارغ التحصیل بھٹو اپنا دانہ پھینک رہا تھا اور شیخ مجیب الرحمان اپنا رول ادا کر رہا تھا۔

شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لایا گیا اور مشرقی پاکستان کے عوام جہاں پر مسلم لیگ کی بنیاد 1906ء میں رکھی گئی تھی اور اس وقت سے بنگال مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کا ہراول دستہ تھا، کہ اوپر آگ اور بارود کی بارش کردی گئی۔ کروڑوں لوگ بھاگ کر بھارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ بھارت ان کے لئے جائے پناہ جہاں سے بھاگ کر انہوں نے 1947ء میں جانیں بچائی تھیں۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھی جائے۔ اس صورتحال سے انڈیا نے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ کیوں نہ کرتا وہ تو دشمن تھا۔ وہ تو دوقومی نظریہ کو ناکام کرنے کیلئے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتا تھا اور ہمارے ان جرنیلوں کی کوتاہ اندیشی نے اسے یہ موقع سونے کی طشتری میں رکھ کر دیدیا۔ اب دونوں طرف جنگ کی تیاری تھی مگر بدقسمتی دیکھی جائے کہ ہمارے اپنے عوام کی اکثریت کیخلاف ہماری اپنی ہی فوج برسرِ پیکار تھی، اس میں فتح کس کا نصیب تھا۔ اور شکست کس کا مقدر تھا۔ اس کیلئے کسی فلسفی یا نجومی کی ضرورت نہیں تھی۔ جنگ کی صورت میں نتیجہ صاف ظاہر تھا مگر جن کی عقل پر حرص کے پردے

پڑ جائیں، انہیں کون سمجھا سکتا ہے۔

اس زمانے کی باتیں بہت ہیں اور دکھ بھی بہت ہیں، وہ باتیں اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ مگر ایکبات سن لیجئے شیخ مجیب الرحمان جب یہاں جیل میں بند تھا تو اس کی خدمت کے بہانے ہماری انٹیلی جنس بیورو کا ایک ایس پی شیخ عبدالرحمٰن اسکے ساتھ مشقتی کے روپ میں ہر وقت رہتا تھا۔ شیخ عبدالرحمٰن ایک بہت ہی ذہین پولیس افسر ہیں اور اپنے کام میں بہت ماہر آدمی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن اکثر کہتا کہ جنرل یحییٰ خان جو کچھ بھی کر رہا ہے، وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ اس کے نتائج خوفناک نکلیں گے اور شاید ملک ٹوٹ جائے۔ یحییٰ خان کو میرا پیغام پہنچاؤ کہ خدارا اس کام سے باز آ جائے اور عوام کے ساتھ افہام و تفہیم سے کام لے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ایک ایسا وقت آئیگا کہ پھر یہ کھیل میرے ہاتھ سے بھی نکل جائیگا اور پھر میری بات لوگ نہیں سنیں گے۔

یہ باتیں باقاعدہ جنرل یحییٰ خان تک پہنچائی گئیں مگر وہاں سے کبھی کوئی جواب نہ آیا، وہاں تو گیم ہی اور تھی اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کھیلی جا رہی تھی۔ اب اللہ ہی جانے کون محبِّ وطن تھا یا سب کچھ فراڈ تھا۔ ویسے شیخ مجیب الرحمٰن طالب علمی کے زمانہ میں حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ایک ورکر تھا اور ڈھاکہ سے بائیسکل پر بیٹھ کر قائداعظمؒ کی زیارت کیلئے کلکتہ جایا کرتا تھا۔ شاید جیل میں اسے وہ زمانہ یاد آتا ہوگا مگر جنرل یحییٰ خان ٹس سے مس نہ ہوا اور آخر کار بات جنگ تک پہنچ گئی۔ دسمبر 1971ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستان کے عوام پہلے ہی جنرل یحییٰ خان کی فوج سے دل برداشتہ تھے، وہ بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے

ہوئے اور پھر 16 دسمبر 1971ء کا وہ تاریخی منحوس دن آ گیا جب ہماری مشرقی کمان کا کمانڈر جنرل عبداللہ خان نیازی جو خود کو ٹائیگر کہلواتا تھا، نے ہندوستان کے جنرل اروڑہ کے سامنے پلٹن میدان میں ہتھیار ڈال کر 93 ہزار جنگی قیدی ان کے حوالے کر دیئے۔ قائداعظمؒ کا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور قائداعظمؒ کا محنت سے تراشا شاہکار چکنا چور ہو کر رہ گیا کہ جنرل ایوب خان اور بعد میں جنرل یحیٰی نے پاک سرزمین کے نظام قوت اخوت عوام سے منہ موڑ کر اس کی اساس ہی ہلا دی تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جس جسم سے روح نکل جائے، وہ جسم پھر لاش کہلاتا ہے۔ جس دن سے جنرل ایوب خان نے اندرون ملک دخل اندازی شروع کی اور پھر امریکہ کو خوش کرنے کیلئے شب خون مارا، اس دن سے خدا کی بستی کے اندر سے مسلم قومیت کی روح نے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ پھر اس میں لسانیت وعلاقائیت، فرقہ واریت اور اسلامی سوشلزم کے بھوتوں نے ڈیرے ڈال دیئے اور آخر کار یہ دولخت ہو کر رہ گیا۔ روح کے بغیر جسم زندہ نہیں رہا کرتے۔ پاکستان کسی زمین کا نام نہیں ہے۔ زمین اس کی شناخت ضرور ہے مگر پاکستان نظریئے کا نام ہے اور وہ قائداعظمؒ کا عنایت کردہ نظریہ، جس کے مظاہر میں سے ایک مظہر اسلامی جمہوری اور فلاحی پاکستان ہے۔ اور جب بھی ہم پاکستان کے اساسی نظریہ سے منہ موڑیں گے، ہمارا یہی حال ہوگا اور ہونا تھا۔ اس نظریہ کے بنیادی اجزاء میں سے جمہور جمہوریت اور اسلام کو آپ نکال ہی نہیں سکتے۔ دنیا کے اور بہت سے ملک اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں مگر پاکستان اسکا متحمل نہیں ہوسکتا کیونکہ پاکستان کی بنیادیں اسی پر استوار ہیں، بنیادیں ہی نہیں، اس

کا اینٹ اور گارا ابھی اسی مرکب سے منفرد اور روح پرور ہے۔ اسے چھیڑنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ جن بدبختوں نے اس کی ہیئت ترکیبی تبدیل کرنے کی کوشش کی اور کر رہے ہیں، وہ بڑے ہی بدبخت لوگ ہیں، خدا انہیں ہوش کے ناخن دے۔

اصل میں بے بصیرت و بے نگاہ حکمران اللہ کے لوگوں کیلئے ایک مصیبت بن کر آتے ہیں اور جنرل یحیٰی خان ان مصیبتوں میں سے ایک تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن تو جیل سے اسے وقت کی اہمیت اور بروقت فیصلوں کا احساس دلاتا رہا۔ مگر اس بدبخت کو تو بعد از واقعہ بھی احساس نہیں تھا۔ وہ کوئی بہت موٹی کھال کا بنا انسان تھا۔ حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے پیش کر کے ایک دن میں اسے واپس بنی بنگلہ ضلع گجرات لے جا رہا تھا کہ اس نے اصرار کیا کہ میں اسے راولپنڈی لے چلوں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اس بات کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے میں لوگوں کے سخت ردعمل سے ڈرتا تھا کہ اگر لوگوں نے یحیٰی خان کو دیکھ لیا تو شاید وہ اس کی تکہ بوٹی کر دیں کیونکہ ابھی ذلت آمیز شکست کا گھاؤ تازہ تازہ تھا اور سقوطِ ڈھاکہ کو ابھی دو تین مہینے ہی گذرے تھے۔ جب میں نے عذر پیش کیا اور کہا کہ لوگ اس سے بہت خفا ہیں تو وہ ڈھیٹ شخص پنجابی میں کہتا ہے: ''کہ میں کوئی کھوتی توں ہتھ لگا دتا اے کہ لوگ میرے نال خفا نیں۔'' اب آپ اندازہ لگالیں کہ اتنی بڑی شکست کے بعد بھی اس بے شرم کو کوئی ندامت نہیں تھی کہ اس نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ وہ اپنی ہی ذات میں مست تھا اور بے چارہ شیخ مجیب الرحمٰن اس سے اس وقت امید لگائے بیٹھا تھا جب تک یہ سب کچھ ابھی ہوا بھی نہیں تھا۔ اور یہاں سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی اسے احساس نہیں تھا۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ جرنیلوں کا کام حکمرانی نہیں ہے بلکہ چرچل تو یہاں تک کہہ گیا ہے

کہ:

War is too delicate a matter to be left to the generals alone.

ترجمہ: ''جنگ اتنا نازک مسئلہ ہے کہ اسے اکیلے جرنیلوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔''

اور ہم ہیں کہ حکمرانی کیلئے جرنیلوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ دراصل ہم نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں بلکہ جرنیل ہمیں یہ نظارہ دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ملک پیچھے رہ گیا ہے، فیل ہوگیا ہے، یہ سب کچھ ان ہی دوستوں کا کیا دھرا ہے۔ اس میں ہمارا اور ہمارے عظیم قائد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے اندریں حالات جو کچھ کیا تھا، وہ ایک بہت ہی عظیم کارنامہ تھا وگرنہ سپین کی طرح آج مسلمانوں کا ہندوستان میں نشان تک نہ ملتا۔ جو بعد میں خرابی آئی، اس کے ہم ذمہ دار ہیں مگر انشاء اللہ یہ خرابیاں بھی دور ہو جائینگی، تھوڑی سی ہوشمندی اور بیداری کی ضرورت ہے اور وہ ضرور آئیگی۔ انشاء اللہ۔

اے خاصہ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

صبح کاذب

جنرل یحییٰ خان اپنا کام دکھا کر چلا گیا۔ وہ اس سے آگے اور کیا جاتا۔ پاکستان کے بپھرے ہوئے عوام اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لوگ اپنے وطن کو ٹوٹتا دیکھ کر ایک غضبناک موڈ میں تھے۔ اور وہ جنرل یحییٰ اور اسکے ساتھیوں کا سر قلم دیکھنا چاہتے تھے۔ مقتدر ٹولے نے اقتدار سے چمٹے رہنے کی بڑی کوشش کی مگر عوام ریلے کے سامنے ان کی ایک بھی نہ چل سکی۔ چونکہ اس وقت باقی ماندہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو واحد منتخب اور موثر لیڈر تھا، اسلئے حکمرانی کیلئے قرعہ فال اسکے نام نکل آیا اور وہ 20 دسمبر 1971ء کو پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ منتخب عوامی لیڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر دو متضاد چیزیں تھیں مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا ورنہ اقتدار کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور ریاستی قوت کا خلا پیدا ہو جاتا۔ اسے بہر صورت جنرل یحییٰ خان ہی کی جگہ پُر کرنا تھی کیونکہ اسوقت کوئی دستور تھا اور نہ ہی کوئی قانونی لائحہ عمل۔ اب سب کچھ اسی اتحاد الضدین سے پیدا ہونا تھا۔ اور منچلے لوگوں نے اس مجموعہ الضدین کا نام عوامی دور رکھ لیا۔ آیا وہ جمہوریت کی طرف

مراجعت تھی یا فاشزم تھا، اسکی تفسیر وقت ہی بتا سکتا تھا۔ قوم کے پاس اس وقت اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ بھٹو اور پاکستان کیلئے اب بڑے ہی مشکل حالات کا سامنا تھا اور درحقیقت اسوقت پاکستان ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا۔ ہماری ایک واضح فوجی شکست اور سیاسی شکست وریخت ہو چکی تھی۔ پاکستان کا خطہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ مشرقی بازو بھارت کے مکمل قبضہ میں تھا اور مغربی پاکستان کا بھی بہت سا حصہ بھارت نے فتح کر لیا تھا۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا تھا کہ پاکستان کس خطے کا نام ہے، وہ جو اب بنگلہ دیش ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے یا وہ خطہ جو ابھی پاکستان کے نام ہی سے موسوم ہے۔ اگر یہ اپنی مگوبی زمین کا ٹکڑا پاکستان ہے تو پھر بین الاقوامی قرضے کس کے ذمہ ہیں۔ اگر سب اس کے ذمہ ہیں تو پھر کیا یہ حصہ اس بوجھ کا متحمل ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اگر یہ پاکستان ہے اور بنگلہ دیش اس سے علیحدہ ہوا ہے تو قومی مشترکہ ورثہ اور سرمایہ میں سے علیحہ ہونے والے بھائی کا کتنا حصہ ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر کیا پاکستان مغربی پاکستان یہ بوجھ برداشت کر سکے گا۔ مزید برآں وہ پاکستانی جنگی قیدی جو بھارت کے ہاتھ چڑھ گئے تھے، ان کی بریت کیسے ہوگی۔ یہی نہیں، شیخ مجیب الرحمان اب مطالبہ کر رہا تھا کہاں جنگی قیدیوں میں سے کم از کم پندرہ سوسینئر فوجی افسروں کا وہ جنگی جرائم کیلئے ٹرائل کرنا چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر کہ اب شیخ مجیب الرحمان کا کیا کیا جائے۔؟

یہ سوالات اور اسی نوع کے اور سوالات مل کر اب قائد اعظمؒ کے پاکستان کو ہی ایک سوال بنائے ہوئے تھے۔ پاکستان کے ذمہ داران اب کیا کریں؟ واقعی یہ ایک بہت ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ بھٹو کو عوامی تائید ضرور حاصل تھی مگر اس کے سیاسی مخالفین

اس پر انگلیاں بھی اٹھا رہے تھے کیونکہ پاکستان کے دولخت ہونے میں موصوف کا رول بھی تھا۔ وہ اس المیہ کا حصہ دار تھا۔ اسلئے اسکی اپنی حیثیت متنازع تھی اور یہ اس کا بہت ہی کمزور پہلو تھا مگر ان گنجلک مسائل کا حل بھی بہت ضروری تھا۔ اور ان کے تسلی بخش حل کے بغیر آگے کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا تھا اور یہ تمام مسائل پاکستان کی بنیادی ہیئت ترکیبی ہی نہیں بلکہ اس کے بین الاقوامی وجود سے متعلق تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک نہایت ہی ذہین وفطین اور شاطر شخص تھا اور اس نے آتے ہی فیصلہ کیا کہ وہ ان سب بکھرے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اکٹھا کریگا اور اس نے آتے ہی شکست خوردہ اور پژمردہ قوم کو یقین اور خود اعتمادی کے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے۔ اور اس کیلئے اس نے طرح طرح کے ڈرامے بھی رچائے۔ یہ کام کوئی جرنیل یا بیوروکریٹ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کام کوئی عوامی لیڈر ہی کر سکتا تھا اور وہ بھٹو نے نہایت کامیابی سے کیا اور قوم کو لڑنے مرنے کیلئے تیار کرنا شروع کر دیا۔ کم از کم الفاظ اور تقاریر کی حد تک یہ کام شروع ہوگیا۔ گو کہ عملی طور پر یہ ابھی ممکن نہیں تھا۔ دراصل بھٹو چاہتا تھا کہ لوگ ماضی کو بھول کر مستقبل کی طرف دھیان لگا دیں۔ محض ماضی پر رونے دھونے سے کیا بنتا ہے، شاید اسے اپنا ماضی بھی اسوقت اچھا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ اسے بھولنے اور بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات ذاتی طور پر بھی اس کیلئے ٹھیک تھی تو پھر قوم کیلئے بھی اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

لہذا اس حکمت عملی کے تحت اس نے بھارت سے علاقے واگذار کرانے فوجوں کو سرحدوں سے پیچھے لانے، قرضے ری شیڈول کروانے، جنگی قیدیوں کو واپس لانے، پاکستان کو نیوکلیئر طاقت بنانے اور ملک کو ایک متفقہ دستور دینے کی ترجیحات

متعین کیں اور ان سب کیلئے پاکستان کے سیاسی، سفارتی اور زمینی وجود کو تسلیم کروانا ضروری تھا جسے ذوالفقار بھٹو نے نہایت چالاکی سے بنگلہ دیش کے وجود کو تسلیم کرنے سے منسلک کرلیا اور اعلان کر دیا کہ جو ملک بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرے گا، اس سے پاکستان خفا ہو جائیگا۔ بظاہر اس دھمکی میں کوئی جان نہیں تھی مگر ذوالفقار علی بھٹو نے اس کارڈ کو خوب کھیلا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ذہین سفارت کاری نے سب سے پہلے اسلامی دنیا کو اپنی طرف مائل کیا اور پاکستان کے مسئلہ کو اسلامی دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے چین کی دوستی کا کارڈ دکھا کر امریکہ کو اس حد تک قائل کیا کہ پاکستان کا وجود علاقائی سلامتی اور طاقت کے توازن کیلئے از حد ضروری ہے، وگرنہ روس کی بالادستی کام دکھا جائیگی۔ یہ کارڈ بھی کامیاب رہا۔ اور خاص طور پر پاکستان کے قرضے ری شیڈول کروانے میں یہ سفارت کاری بہت ہی معاون ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے کاروبارِ حیات وسلطنت چل پڑا۔

اس کے بعد اس نے بھارت سے معاملات طے کرنے کی ٹھانی کہ اس کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اندرا گاندھی سمجھتی رہی کہ جنگی قیدی پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک ہے مگر بھٹو چاہتا تھا کہ پاکستان کے علاقے بھارت سے چھڑوالئے جائیں۔ علاقوں سے یہاں مطلب ہے مغربی پاکستان کے ساتھ طے شدہ سرحدیں۔ علاقے کا یہاں مطلب مشرقی پاکستان نہیں تھا اور نہ ہی کشمیر کا علاقہ کہ اسکے لئے بھٹو نے سیز فائر کی جگہ لائن آف کنٹرول کی ترکیب سوچ لی تھی مگر یہ معاملہ اتنا آسان نہیں تھا اور جب بھٹو ان معاملات کو طے کرنے شملہ گیا تو بہت زیادہ بحث وتمحیص کے بعد اندرا گاندھی

وزیراعظم بھارت جنگی قیدیوں پر تو اڑی رہی مگر علاقے خالی کرنے کی حد مان گئی اور شملہ معاہدہ ہوگیا، جس کی رو سے پاکستان کے وہ علاقے جو بھارت کے قبضے میں چلے گئے تھے، وہ خالی ہونا قرار پائے اور دونوں ملکوں کی فوجوں کو سرحدوں سے دور کرنے کا عمل شروع ہوا۔

بھٹو نے جنگی قیدیوں کا مسئلہ بنگلہ دیش کو پاکستان کی طرف سے تسلیم کرنے کے ساتھ منسلک کردیا اور اسے ایک بین الاقوامی خاص طور پر بین الاسلامی مسئلہ کے طور پر لیا اور بنگلہ دیش کو اسکا پاکستان کی طرف سے تسلیم کروانے کی اہمیت کو کلیدی ہونے کا احساس دلایا۔ بھٹو نے یہ سارے کارڈ بہت عمدگی سے کھیلے کہ سفارت کاری واقعی اسکا مضبوط پہلو تھا۔ اس کام کیلئے ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی دنیا کی ایک سربراہی کانفرنس فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد کی اور ایک اسلامی برادری کے تناظر اور اصرار کے منظر میں ایک اسلامی برادر ملک کے طور پر بنگلہ دیش کو اس طرح تسلیم کیا کہ وہ پھر وہ چند پاکستانی جرنیلوں کی بحیثیت جنگی مجرم کی ٹرائل سے بھی دست کش ہوگیا اور جنگی قیدیوں کی بھارتی جیلوں سے بریت کیلئے بھی راضی ہوگیا۔ مزید برآں پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان مشترکہ قومی سرمایہ اور سامان کی تقسیم بھی ملتوی ہوگئی۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا ان حالات میں ایک بہت بڑا کارنامہ تھا مگر مخالفین نے اسے کسی اور ہی رنگ میں لیا اور اسے قائداعظمؒ کے پاکستان کی باقاعدہ قانونی اور دستوری تقسیم کا نام دیا۔ فوجی شکست کے بعد 1971ء میں یہ تقسیم زمینی حقائق کے طور پر ہوئی مگر 1974ء میں یہ تقسیم واقعاتی کے علاوہ قانونی بھی ہوگئی۔ مگر اب اسکے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرکے ایک مشکل سیاسی فیصلہ

کیا۔ مگر جو ہوا، وہ مسئلہ کے لٹکے رہنے سے بہتر تھا اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے قتل کے بعد نہ صرف ایک دفعہ پھر وہی بنگلہ دیش اسلامی جمہوریہ کہلوایا بلکہ بھارت کے مقابلہ میں پاکستان کے زیادہ قریب آ گیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی بصیرت ہی کا ایک ثبوت تھا۔ اس سے قبل بھی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو بروقت واپس بنگلہ دیش بھیج کر اپنی دوررس نگاہ اور اعلیٰ بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔ میں خود اس اجلاس میں شامل تھا جہاں بھٹو نے یہ فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کے پیچھے مرکزی دلیل یہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن واحد ایسا بنگالی لیڈر ہے جو پاکستان کی شکست اور بھارتی قبضہ کے بعد بنگلہ دیش واپس جا کر حالات کو اسطرح سنبھال سکتا ہے کہ بھارت وہاں اپنے پاؤں جمانے کا بہانہ نہ بنا سکے اور اس نے اس وجہ سے شیخ مجیب الرحمٰن کو فوراً چھوڑ دیا بلکہ سرکاری طور پر لندن روانہ کیا۔ ڈھاکہ کی بجائے لندن بھی اسلئے روانہ کیا کہ سیدھا ڈھاکہ بھیجنے میں اسوقت بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہوتا۔ بھٹو اس وقت بھی یہ فیصلہ 1974ء کی تسلیم کے فائدے سامنے رکھ کر کر رہا تھا۔ ایک سیاستدان کیلئے وہ فیصلہ بھی مشکل تھا اور اب کا فیصلہ بھی بہت ہی مشکل تھا مگر وقت نے ثابت کیا کہ یہ فیصلے بہت درست تھے۔ بھٹو صاحب کی ذہانت اور اعلیٰ سفارت کاری نے بغیر کچھ دیئے بہت سارے کام نکال لئے اور پاکستان کو ایک دفعہ پھر پاؤں پر کھڑا کر دیا اور بہت ہی کم وقت میں کھڑا کر دیا۔

اسی دوران بھٹو نے پاکستان کو ایک متفقہ دستور دیا جو اس کا بہت بڑا کام ہے اور ہمیشہ یہ کارنامہ یاد رکھا جائے گا۔ ویسے ذوالفقار علی بھٹو صدارتی نظام چاہتا تھا مگر رائے عامہ نے اس کی بات نہ ماننے دی اور ایک عوامی لیڈر ہونے کی وجہ سے اسے

رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اسی طرح وہ کوئی اسلامی جمہوریہ وغیرہ کے الفاظ نہیں چاہتا تھا مگر ہماری قوم کا کمال ہے کہ وہ اپنے دین کے شیدائی ہیں کہ انہوں نے بھٹو جیسے آدمی کو بھی مجبور کردیا کہ وہ دستور کو اسلامی کہے اور اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھے۔ جس اسلامیہ لفظ کو بدبخت جنرل ایوب خان نے دیس نکالا دیدیا تھا۔

بھٹو صاحب کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ نہایت رازداری سے نیوکلیئر پروگرام کو شروع کرنے کا ہے۔ مندرجہ بالا اور اسکے علاوہ بے شمار بنیادی مسائل کے باوجود بھٹو نے اس پروگرام کو اپنی سب سے پہلی ترجیح بنایا اور اس سلسلہ میں بہت ہی جرات مندانہ فیصلہ کئے جس کے لئے بعد میں اسے اپنی زندگی تک گنوانی پڑی۔

ذوالفقار بھٹو نے واقعی ٹوٹے پھوٹے پاکستان کی ایک زبردست تشکیل نو کی اور اسکے اندر ایک نئی روح پھونک دی مگر اسی ذوالفقار علی بھٹو کے اندر نہایت ہی مہلک سقم تھا کہ وہ ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر تھا اور اس کا وہی رجحان اسکیلئے اور ملک کیلئے نہایت ہی نقصان دہ بلکہ جان لیوا ثابت ہوا۔ بھٹو ایک تو جاگیردار تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ سیاسی کیریئر ہی ایک فوجی ڈکٹیٹر ایوب خان کے زیرسایہ شروع ہوا تھا۔ گو وہ اپنے آپ کو عوامی کہلواتا تھا اور جمہوریت کا دعویدار تھا مگر اندر سے وہ ایک دوسرا ایوب خان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ ایک ہٹلر تھا۔ اس نے ایک جمہوری دستور ضرور دیا مگر ایک دن بھی اس پر عمل نہ کیا اور ایمرجنسی کی آڑ میں آمریت کو چلنے دیا۔ اپنے پورے دور حکومت میں دفعہ 144 نافذ کئے رکھی۔ اور سیاسی مخالفین کو بدترین تشدد اور فاشزم کا شکار کرتا رہا۔ سفارتی محاذ پر بہت کامیابیاں حاصل کیں مگر اندرون ملک کے نظم ونسق کو ایک بدترین راجواڑے کی طرح چلایا۔ چلایا نہیں بلکہ بگاڑا۔ مخالفوں کو جھوٹے

مقدمات میں پھنساتا رہا، قتل کروایا رہا، جیلوں اور تھانوں میں ذلیل کراتا رہا اور یہ ذلتیں جب حد سے گذر گئیں تو پاکستان کے عوام اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ پاکستان کے عوام کی گھٹی میں اصلی جمہوریت رچی بسی ہوئی ہے کہ وہ اپنے اصلی قائد کے اصلی پیروکار ہیں جنہوں نے انگریز اور ہندو کے مقابلے کیلئے بھی کبھی قانون نہیں توڑا تھا اور ایک پرامن جدوجہد کے ذریعے قوم بنائی اور پھر ملک تخلیق کردیا تھا، وہ لوگ اپنی اصل سے کیسے انحراف کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تو ایوب خان کی آمریت کو برداشت نہ کیا، وہ اسکے شاگرد بھٹو کی ناجوازیاں کیسے برداشت کرتے۔ وہ ہر مشکل مرحلے پر اپنے اصلی قائد کی سنت پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے انتخابات میں زبردست دھاندلی کی اور لوگوں پر اپنی پولیس اور ایف ایس ایف کے ذریعہ ظلم کی انتہا کردی تو پھر لوگوں نے اپنی آزادی اور جمہوری وانسانی حقوق کی خاطر جانوں کی قربانیاں دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ ایک عظیم قائد کی تربیت یافتہ قوم تھی۔ بھٹو کی تمام گولیاں جواب دے گئیں۔ بھٹو کے تمام بڑے بڑے کام دھرے کے دھرے رہ گئے کہ لوگ کسی بھی قیمت اپنی آزادی تیاگنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ انہیں اپنی آزادی سے زیادہ عزیز تھی۔ ویسے بھی بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا شوشہ چھوڑ کر قائداعظمؒ کے مسلم قومیت کے اسلامی نظریہ کو زک پہنچائی تھی، لہٰذا عوام نے فیصلہ کرلیا کہ ملک پاکستان میں اصلی جمہوریت درکار ہے۔ وہ کسی بھی قیمتی پر فوجی یا سویلین آمریت نہیں چلنے دینگے۔ مگر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ جمہوریت کی بجائے ایک دفعہ پھر فوجی راج ہمارا نصیب ٹھہرا۔ جنرل ضیاء الحق کمانڈر انچیف پاکستان جو ہر طرح سے بھٹو کا پانی بھرتا تھا اور

اسکی وفاداری کی قسمیں کھاتا رہتا تھا، نے جب دیکھا کہ اب بھٹو نہیں چل سکتا تو اس نے 5 جولائی 1977ء کو راتوں رات شب خون مارا اور ملک و ملت کو مزید جمہوریت کی طرف رواں دواں نہ رہنے دیا۔ اسوقت تو بھٹو نئے انتخابات کا مطالبہ مان چکا تھا لیکن ضیاء الحق نے ملک کو ایک دفعہ پھر مارشل لاء کی اذیت کا شکار کر دیا۔ عوام کی روشنی کی خواہش کو ایک دفعہ پھر حق کی روشنی (ضیاء الحق) نے راتوں رات مارشل لاء کی ظلمت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح جیسے امن پسند دستور پسند اور جمہور و جمہوریت پسند قائد کی قوم شاید اس سلوک کی مستحق نہیں تھی مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ اس قائد کے ملک میں جنرل ایوب خان اس رسم بد کو رواج دے چکا تھا اور ہر آنے والا اسی کج روی کا پرستار و شاہکار نکلتا ہے۔ قدرت کے رنگ نرالے ہوتے ہیں، جھوٹا گاندھی عدم تشدد کا پرچار کرتا ہے مگر ہمیشہ تشدد کی راہ پر چلتا ہے۔ عدم تشدد کے پیامبر کی قوم اگر ایٹم بم بناتی ہے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک مکار لیڈر کی قوم بس مکار ہو گی۔ کہے گی کچھ اور کرے گی کچھ اور، مگر قائداعظمؒ تو ہمیشہ وہی کرتے تھے جو وہ کہتے تھے۔ ان کا ظاہر باطن ایک تھا، پھر کیوں اسکی قوم کے ساتھ یہ ہو رہا تھا اور بار بار ہو رہا تھا۔ مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ قوم کا یہ مزاج قطعاً نہیں ہے۔ یہ دوئی صرف اور صرف ایک خاص طبقے کا خاصہ ہے جسے ہم خواص یا اشرفیہ کہتے ہیں اور پوری قوم اسکی سزا بھگت رہی ہے۔ کسی دن تو انصف ہو گا۔ عوام بار بار قربانی دیتے ہیں مگر یہ خواص بار بار دھوکہ دے جاتے ہیں اور آخری وقت میں بلیوں کی لڑائی میں بندر پھل کھانے پہنچ جاتا ہے اور وہ بندر اس دفعہ جنرل ضیاء الحق کا تھا اور وہ قائداعظمؒ کے دیس میں غیر جمہوری ہتھوڑے سے قائداعظمؒ سر پھوڑنے آگیا۔ وائے ناکامی وائے

شبِ ظلمت

جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگاتے ہی اعلان کیا کہ وہ روحِ دستور کی پاسداری کریگا اور آئین کو وہ صرف معطل کر رہا ہے، ختم نہیں کر رہا اور تین مہینے بعد وہ الیکشن کروا کر واپس چلا جائیگا۔ کیونکہ امن عامہ کی بہت ہی مخدوش حالت کے مدنظر اسے ملک بچانے کیلئے یہ غیر دستوری اقدام بہت ہی مجبوری کی حالت میں اٹھانا پڑا ہے۔ اکثر لوگوں نے جنرل صاحب کے اعلان پر یقین رکھا اور سوچا کہ یہ جنرل قائداعظمؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پاک سرزمین کے نظام کو قوت اخوت عوام کی طرف واپس کر دے گا اور جنرل ایوب اور یحییٰ خانکی غلط روش کو نہیں آزمائے گا۔ اس یقین کیلئے لوگوں کے پاس 1971ء کے تلخ تجربات کی دلیل تھی۔ جب مارشل لاؤں کے غیر جمہوری رویوں نے آخرکار پاکستان کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور لوگوں کو گمان تھا کہ

اب جنرل ایسی کوئی خیانت نہیں کرینگے مگر عوام کی آرزوئیں اور خواہشیں نقش برآب ثابت ہوئیں اور جنرل ضیاء الحق سچ کی روشنی کے بجائے باطل کی ایک طویل تاریکی ثابت ہوئے۔انہوں نے اپنے سب وعدے بھلا کر حیلوں بہانوں سے اپنے اقتدار کو طول دینا شروع کر دیا۔بھٹو کو ایک قتل کے مقدمے کے سلسلے میں پھانسی چڑھا دیا او پیپلز پارٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔

ان مقاصد کے حصول کیلئے جنرل ضیاء الحق نے وہ تمام غلط اقدامات جاری رکھے جن کا ذکر جنرل ایوب خان کے حوالہ سے پہلے ہو چکا ہے۔انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔جنرل ضیاء الحق نے سیاسی ادارے ختم کر کے قوت اخوت عوام کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا مگر اعلیٰ عدالتوں کو جس طرح بے بس اور ذلیل کیا، اس میں وہ جنرل ایوب خان کو بھی مات دے گیا۔پہلے انہیں خوب استعمال کیا۔چند ماہ کیلئے اپنے اقتدار کا جواب بھی لے لیا۔دستور میں ترمیم کے اختیارات بھی سپریم کورٹ سے حاصل کر لئے۔بھٹو کی پھانسی کا بندوبست بھی ان ہی کے ذریعہ کر لیا اور اسکے بعد پی سی او کے ذریعہ بہت سے اعلیٰ وصالح جج صاحبان کو باہر نکال پھینکا اور پورے عدالتی نظام کو بے بس کر کے رکھ دیا۔اس سارے کام میں جنرل ضیاء الحق نے بہت زیادہ مکاری اور کذب گوئی سے کام لیا اور بیسویں صدی کا منافق ترین حکمران مشہور ہوا۔

عام عدالتی نظام کا خلا جنرل ضیاء الحق نے فوجی عدالتوں کے ذریعہ پر کیا جہاں پر انصاف کی جگہ حکم حاکم کا سکہ رائج تھا۔مخالفین کیلئے ہر سزا جائز تھی اور ہم خیال لوگوں اور دوستوں کے تمام گناہ معاف تھے اور پھر ظلم اور بے انصافی کا ایسا دور دورہ آیا کہ لوگوں کے دل جل اٹھے۔ضیاء الحق کی پولیس اور فوج جسے چاہتی پکڑتی اور جسے

چاہتی چھوڑتی، پورا پاکستان ایک عقوبت خانہ بن گیا۔ لاہور کا شاہی قلعہ اور اٹک کا قلعہ تو بس ان کی مختلف صورتوں کی چند ایک علامتیں تھیں وگرنہ قریہ قریہ، شہر شہر ٹکٹکیاں لگی ہوئی تھیں اور کوڑے مار کر معصوموں کی چیخیں لاؤڈ سپیکر پر سنا سنا کر عامۃ الناس کو خوف زدہ کیا جا رہا تھا۔ یوں ایک نہایت ہی پر امن اور شائستہ و مہذب معاشرہ کو تشدد کے سبق پڑھا پڑھا کر غیر مہذب اور سفاک بنایا جا رہا تھا۔ اور یہ ان لوگوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا تھا جن کی عزت و آبرو کی حفاظت کیلئے ان کے عظیم قائد نے اتنی بڑی دستوری اور سیاسی جنگ لڑی تھی۔ شاید وہ کراچی کے مزار سے سب کچھ دیکھ کر تڑپتا تو ضرور ہوگا۔ شاید اسی لئے جنرل ضیاء الحق قائداعظمؒ کے مزار پر کم ہی جاتے تھے کہ کہیں وہاں سے کوئی ''جھڑکی'' ہی نہ پڑ جائے۔

جنرل ضیاء الحق کے ظلم و ستم کا نشانہ صرف پیپلز پارٹی ہی نہیں تھی، یکے بعد دیگرے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اس کا شکار ہوئیں۔ خود پی این اے، جو شروع شروع میں جنرل ضیاء الحق کے ساتھ تھی، کے ساتھ بھی وہی مکارانہ رویہ اپنایا گیا جو رویہ اس نے اعلیٰ عدالتوں کے ساتھ اپنایا تھا۔ بھٹو کی پھانسی کے ساتھ ہی پی این اے کو اپنی حکومت سے نکال دیا۔ اس وقت تک ان کی ضرورت تھی اور وہ انہیں اس کام میں برابر کا شریک کرنا چاہتا تھا مگر جونہی یہ کام نکلا، ان سے منہ پھیر لیا۔ بلکہ بعد میں نوابزادہ نصر اللہ خان، ولی خان، ایئر مارشل اصغر خان اور دیگر سیاسی زعماء کو سالہا سال تک پابند سلاسل کر دیا۔ بعض کے ایک صوبے سے دوسرے صوبے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ اسوقت یہ لطیفہ بہت عام تھا کہ آئندہ پاکستان کے اندر ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے کیلئے ویزا درکار ہوگا۔ یہ تقسیم در تقسیم کا کام اس قائد کے

ملک میں ہو رہا تھا جس نے 11 اگست 1947ء کی اپنی سب سے پہلی تقریر میں قوم کو ایک قوم بننے کی تلقین کی تھی۔ جہاں اس صاحبِ نظر انسان نے صوبائیت اور علاقائیت کو اس نوزائیدہ قوم کیلئے زہرِ قاتل گردانا تھا۔ مگر جنرل ایوب سے لیکر جنرل ضیاء الحق تک اس نسخے کے بالکل برعکس عمل کر رہے تھے۔ ان بدبختوں نے تو اپنے ذاتی اور گروہی اقتدار کیلئے ''تقسیم کرو، حکومت کرو'' کی پالیسی کو حرزِ جان بنالیا تھا۔ قائد کی قوم پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے تو اس کام کو بہت ہی سائنسی بنیادوں پر آگے بڑھایا۔ چونکہ پیپلز پارٹی کا زیادہ زور اندرون سندھ تھا تو اس کا توڑ کرنے کیلئے جنرل صاحب نے لسانی بنیاد پر ایم کیو ایم کو منظم کیا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ اس عمل سے ملک کی یک جہتی کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ پتہ نہیں یہ لوگ حب اقتدار کا نام حب الوطنی کیوں رکھ لیتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنی مقصد براری کیلئے صرف غیر اخلاقی سیاسی ہتھکنڈے ہی استعمال نہیں کیے تھے بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں اسلام کو بھی خوب استعمال کیا۔ اور مختلف حیلوں اور بہانوں اور نفاذِ اسلام کے نام پر آرڈی ننسوں سے ملکی اختلافات خاص طور پر شیعہ سنی اختلاف کی خوب آبیاری کی تا کہ قوم ان فروعی مسائل میں پھنس کر رہ جائے اور اس کے ناجائز اقتدار پر کوئی سوال نہ اٹھائے۔ حالانکہ حضرت قائداعظمؒ نے اسی 11 اگست کی تقریر مین اس قضیہ کی قباحتوں پر بہت تفصیل سے بات کر کے اس سے منع فرمایا تھا، مگر جنرل ضیاء الحق ''تقسیم کرو، حکومت کرو'' فارمولا کے تحت اس تقسیم کا خاص اہتمام کرا رہا تھا اور پھر وہ عفریت ایسا ابھر کر نکلا کہ آج تک ہزاروں لاکھوں جانوں کو ہڑپ کر چکا ہے۔ آیئے غور فرمائیں آپ جہاں

بھی اس عظیم انسان کی سوچ اور نظریئے کے خلاف جاتے ہیں، آپ کیلئے مسائل کا ایک انبار کھڑا ہوجاتا ہے۔ خرابی قائداعظم کے نظریئے میں نہیں تھی، خرابی ان مفاد پرست لوگوں کے دل کے اندر سے جنم لیتی ہے اور بے چاری قوم اس کی سزا بھگتتی ہے۔ دراصل فوجی آمریت پنپتی ہی ایسے عوام مخالف ہتھکنڈوں سے ہے اور اس آمریت کا یہ سب سے زیادہ قابل نفرین پہلو ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو ہمیں 16 دسمبر 1971ء کا صدمہ سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں دیکھنا پڑا تھا۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورِ حکومت میں صرف ایک اچھا کام کیا اور وہ تھا قومی نیوکلیر پروگرام کی تکمیل، جسے ذوالفقار علی بھٹو نے شروع کیا تھا۔ قضیہ افغانستان کے حوالے سے چونکہ امریکہ کو روس کیخلاف پاکستان کی اشد ضرورت تھی، اسلئے جنرل ضیاء الحق نے چپکے سے یہ مفید کام جاری رکھا اور امریکہ کے ساتھ ملکر افغانستان کے اندر روس کے خلاف جاری جنگ میں مدد کرتا رہا۔ افغانستان میں اصل کام تو خیر امریکہ ہی نے کیا کہ وہ وہاں روس کی ہزیمت چاہتا تھا۔ مگر اس میں پاکستان کا بھی اہم رول ہے۔ جنگِ افغانستان کے بہت سے مثبت پہلو بھی ہیں کہ آخرکار ایک اسلامی ملک کو روس کے قبضہ سے نہ چھڑالیا بلکہ وہ روس کے بکھرنے کا بھی سبب بنا مگر پاکستان کے لئے اسکے منفی پہلوؤں سے بھی آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ افغاناستان کے اسی قضیہ کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ کلاشنکوف اور ہیروئن کلچر کا شکار ہوا اور پاکستان مجرمستان بن کر رہ گیا۔ ہتھیاروں اور منشیات کی بیجا تجارت نے پاکستانی معاشرہ کی اخلاقی چولیں ہلا کر رکھ دیں اور اس جرم سے کمائی ہوئی بے بہا دولت نے بعد میں ہمارے سیاسی کلچر کو بھی دولت پرست، کرپشن اور جرائم کی آماجگاہ بنادیا۔ عدالتی اور

پولیس نظام کو اتنا تہہ و بالا کر کے رکھ دیا کہ اس کے بعد قائداعظمؒ کے پاکستان کی غارت گری ہونا ہی تھی۔ وہ قائداعظمؒ جس کی سیاست دیانت و امانت کی خوبصورت ترین علامت تھی، وہ سیاست جو شیوہ پیغمبری تھی مگر ہوس کے پجاروں اور اقتدار پسندوں کی مسند پر پہنچی تو زر پرست بن گئی۔ جنرل ضیاءالحق نے انتخابات سے پہلے احتساب کا نعرہ لگا کر ہر شریف آدمی کا ناطقہ بند کر دیا اور جو بھی سامنے آتا، اس کو حیلوں بہانوں سے پھانس لیا جاتا۔ مگر قابو آیا ہوا شخص اگر جنرل کی تابعدار اور فرمانبرداری کی حامی بھر لیتا تھا تو اس کے سب گناہ معاف ہو جاتے بلکہ وہ اسکی مجلسِ شوریٰ کا ممبر بن جاتا۔ اس زمانہ میں ضمیر فروشی اور منافقت کا سب سے زیادہ مفید سکہ رائج تھا اور بنا۔ ایمان فروشی و دین فروشی فیشن بنے۔ بیت المال اور زکوٰۃ کے نام پر علماء دین خرید لئے گئے۔ میڈیا پر سنسر کی تلوار لہرا دی گئی اور ہر طرف سب اچھا اور امن کی شہنائی، خودستائی کا ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔ حالانکہ کلاشنکوف اور ہیروئن نے جرم کے تمام انداز ہی بدل ڈالے تھے۔ اسی زمانہ میں خونی ڈکیتیوں کا عام رواج ہوا اور سندھ کا صوبہ خاص طور پر ڈاکوستان بنا۔ جنرل صاحب کے پسندیدہ طلباء نے اپنے مخالفین کو کھلے عام قتل کرنا شروع کر دیا اور ہر سو خوف کی چادر چڑھ گئی۔ مزدوروں کی تنظیمیں ختم کر دی گئیں اور ایک ایک دن میں درجنوں مزدور قتل کر دیئے گئے۔ جیلیں ٹوٹ گئیں۔ اور سندھ میں تو ایسا طوفان اٹھا کہ کراچی سے کسی ٹرین بس یا ٹرک کا آنا دشوار ہوتا تھا۔ اکثر ٹرانسپورٹ، پولیس اور فوج کی حفاظت میں کانوائے کی صورت میں ہی چل سکتی تھی مگر اسکے باوجود پریس کا گلا گھونٹ کر تاثر یہی دیا جاتا رہا کہ ہر طرف امن ہے۔ اس ساری صورتحال میں جنرل صاحب کی اس افغانستان کی پالیسی کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ پاکستانی

معاشرہ کو اسکی کتنی قیمت ادا کرنا پڑی اور کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ہائے ری ہوسِ اقتدار کہ کیا کیا تجھے نشاط ہے۔ بربادی تیری خوراک ہے اور تباہی تاجدار ہے۔

اس مضمون کا مقصد ان تمام واقعات کی تفصیل درج کرنا نہیں ہے، وگرنہ اس ملک دشمن ٹولے کا دفترِ عمل تو بہت طویل ہے۔ اس لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہیکہ ان لوگوں نے اپنے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر کبھی ملک کی بقا کے نام پر اور کبھی ملک کی سلامتی کے نام پر اس ملک کے اصل مالکوں یعنی عوام کو طرح طرح سے تنگ کیا اور ان کے تمام بنیادی حقوق چھین لئے اور انتہا یہاں تک پہنچی کہ وہ بنیادی انسانی حقوق جو انگریز آقا نے اپنے غلاموں کو دے رکھے تھے، ان کالے صاحبوں نے وہ بھی چھین لئے اور سب کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔ مجھے اس وقت 1970ء کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، میں اس وقت جنرل ٹکا خان کے ساتھ بطور ایس پی انٹیلی جنس کام کر رہا تھا۔ ایک دن رپورٹ آئی کہ قصور میں 69 عورتوں اور بچوں کو خلاف پاکستان نعرے لگانے پر حوالہ حوالات کیا گیا۔ تفصیل معلوم ہوئی کہ وہ بدبخت ضلع کچہری پہنچ کر بار بار ایک ہی نعرہ لگا رہے تھے کہ سرحد کھول دی جائے، ہم اپنے سکھ بھائیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ واقعی یہ نعرہ بہت ہی قابلِ اعتراض تھا۔ مگر یہ لوگ کیوں یہ نعرہ لگا رہے تھے؟ اسلئے کہ ان کے قبضہ میں چلی آئی صدیوں سے اراضی ایک صاحب اختیار جرنیل صاحب نے الاٹ کروالی تھی، وہ لوگ تابع مرضی مزارعے تھے اور سکھوں کی حکومت کے زمانے سے نسل در نسل اسی حیثیت میں اس زمین پر ہل چلاتے آرہے تھے۔ اس زمین کی ملکیت پر سب سے پہلا حق ان ہی کا تھا کہ سکھوں تک نے ان کو کبھی نہ چھیڑا

مگر ایک مسلمان جرنیل کی ہوس زرعی جائیداو نے انہیں گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ ان کی زمین پر پولیس کے ذریعہ نہ صرف راتوں رات قبضہ کر لیا تھا بلکہ انکے آبائی مکانوں کو بھی بلڈوزر سے مسمار کر دیا تھا۔ ان کے گھر کے مردوں کو پولیس اور مارشل لاء والے پکڑ کر لے گئے اور انکی عورتیں اور بچے اب احتجاج کرتے ہوئے یہ نعرہ لگا رہے تھے۔ اگلے دن رپورٹ آئی کہ ان تمام ملک کے غداروں کو گیارہ گیارہ مہینے قید بامشقت کی سزا ملٹری کورٹ سے دے کر جیل بھیج دیا گیا ہے۔ دیکھا ملک وملت کی بقاء کیلئے کیسے کیسے مشکل کام کرنے پڑتے ہیں اور اس طرح کے ہزاروں لاکھوں کام اس طرح کے ہر سیاہ دور میں کیئے گئے اور ضیاء الحق کے زمانے میں تو ان نیک کاموں کی انتہا ہوگئی، خاص طور پر اندرون سندھ مجاہدوں کی مخالفت بہت شدید اور زور افزوں تھی۔

آخرکار پھر ایک ایسا وقت آیا کہ بھٹو کی پیپلز پارٹی جس سے جنرل صاحب نے اقتدار لیا تھا اور پیپلز پارٹی کے مخالف اتحاد پی این اے نے ملکر ایم آر ڈی یعنی تحریک بحالی جمہوریت کی تشکیل دی کہ ملک کے اندر عوام کے بنیادی حقوق کی بحالی کی جدوجہد کی جائے۔ یوں پاکستان کے تمام عوام ایک طرف کھڑے تھے اور ان کی دشمن خاکی اور سویلین بیوروکریسی دوسری طرف کھڑی تھی۔ عوام اپنے عظیم قائد قائد اعظم محمد علی جناح کی عنایت کردہ آزادی اور حقوق واپس لینا چاہتے تھے اور بیوروکریسی کی انقلاب دشمن قوت انہیں محروم رکھنا چاہتی تھیں۔ اب عوام اور بیوروکریسی میں کھلی جنگ کی صف آرائی ہوگئی۔ اسی طرح کی صف آرائی 1971ء میں دیکھنے میں آئی تھی کہ عوام ایک طرف اور افواج دوسری طرف کھڑی ہیں مگر اس دفعہ شکر ہے کہ کچھ جغرافیائی حقیقتیں 1971ء ل ء اعادے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی تھی۔ لہٰذا سال

1983ء میں جنرل ضیاء الحق کیخلاف سارا پاکستان اٹھ کھڑا ہوا۔ تنگ آمد بجنگ آمد والی کیفیت تھی۔ کراچی سے خیبر تک احتجاج ہی احتجاج تھا۔ اک ہنگامہ تھا کہ قیامت شرما جائے۔ کہیں ٹیئر بیس تھی تو کہیں گولی چل رہی تھی۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں اور ہر سمت آگ لگی نظر آ رہی تھی۔ عوام پر ہزار ہا گولیاں بیلی کاپٹروں سے چل رہی تھیں، خاص طور پر صوبہ سندھ کا اندرونی حصہ اسکا خاص ٹارگٹ تھا۔ اب نفرتیں انتہا کو چھو رہی تھیں۔ میں اسوقت بریگیڈیئر ظفر اقبال صاحب کے ساتھ جنرل ضیاء الحق کے خاص سٹاف پر کام کر رہا تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ظفر اقبال صاحب سندھ سے واپسی پر سندھ کے حالات سناتے سناتے زار و قطار رو پڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اب پاکستان کا بچنا محال ہے۔ میں ایک دفعہ پھر 1971ء دوبارہ دیکھ رہا ہوں۔ سندھ میں اب آپ اسلام کا نام نہیں لے سکتے، پاکستان کا جھنڈا نہیں لہرا سکتے اور ہتھیاروں کے بغیر آپ فوجی وردی میں باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ صورتحال اس صوبہ کی تھی جہاں اسلام سب سے پہلے داخل ہوا تھا، باب الاسلام کہلوانے کا شرف رکھتا تھا۔ یہ وہ صوبہ ہے جس کی اسمبلی نے سب سے پہلے پاکستان کے حق میں قرارداد پاس کی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں قائد پاکستان حضرت قائداعظمؒ پیدا ہوئے تھے مگر اب وہاں اس اقتدار پسند ٹولے کے کرتوتوں کی وجہ سے نفرت کا ایک الاؤ تھا جو آتش فشاں بننے کو تھا اور پھر ایک سندھی موثر آواز لندن سے آئی جس نے کہا کہ ہماری لڑائی جنرل ضیاء الحق سے ہے، پاکستان سے نہیں ہے، اسلئے پاکستان اور اسلام کے خلاف بات مت کرو، اور آپ کو پتہ ہے وہ آواز کس کی تھی، وہ آواز بینظیر بھٹو کی تھی اور اس پیغام کو پورے سندھ میں پہنچانے والا ایک طالب علم ایاز سمرو، مجھے اس عظیم محبِ وطن کا صحیح

نام اسوقت بھول رہا ہے مگر وہ سمرو وہی تھا جسے آخر کار اس جرم کی سزا ایکغیلے بے قابو ہجوم نے شکار پور میں شہید کر کے دی کہ وہ انکی نگاہ میں فوجی ٹولہ کا جاسوس اور کارندہ تھا۔ اس طرح کے اور واقعات بھی ہوئے، تفصیل کیلئے میری انگریزی کتاب ''The Ultimate Crime'' پڑھ لیں۔

اب معاملہ اس نہج پر پہنچ چکا تھا جہاں جنرل ضیاء الحق کی فریبی پٹاری میں کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ننگی طاقت جواب دے رہی تھی۔ غالب امکان تھا کہ کہیں خود فوج کے اندر سے کوئی اسکے خلاف آواز نہ اٹھ آئے۔ یہ صورتحال 1971ء میں وقوع پذیر ہو چکی تھی۔ صرف مشرقی پاکستان کی حد تک نہیں بلکہ 16 دسمبر 1971ء کے بعد خود مغربی پاکستان میں جنرل یحیٰی خان کیخلاف بریگیڈیئر ایف بی علی اور جنرل گل حسن صف آراء نظر آرہے تھے اور پھر 1977ء میں یہ کیفیت اسوقت نظر آئی جب لاہور کے ہنگاموں کے دوران گڑبڑ کو دور کرنے کیلئے فوج کے تین بریگیڈیئر صاحبان نے اپنے ہی عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس دن بھٹو کے اقتدار کے خاتمہ کا فیصلہ ان لوگوں کے انکار کرنے پر ہو چکا تھا۔ جنرل ضیاء الحق ہی اسوقت بھی فوج کے سربراہ تھے اور اب جب ایم آر ڈی کی اس تحریک کے بعد یہ خوفناک صورتحال ابھر کر سامنے آئی تو جنرل ضیاء الحق کو وہ سب کچھ یاد آرہا تھا، وہ اپنے اقتدار کی بند گلی میں پہنچ چکا تھا۔ اب اسے کسی پولیٹکل آپشن کی ضرورت تھی کہ انتظامی آپشن سب ختم ہو چکے تھے۔ فریب کاری کی تمام چالیں مات کھا چکی تھیں، اب کسی مہا چالاکی کی ضرورت تھی تا کہ قائداعظم کے آزاد ملک کے آزاد شہریوں کو کسی بڑے گنجلک جال میں پھانسا جا سکے اور وہ جال اسلام کے نام پر بنا گیا کہ لوگوں سے

ایک ریفرنڈم کے ذریعہ یہ سوال پوچھا جائے کہ آیا وہ اسلام کو پسند کرتے ہیں اور اگر وہ اسلام کو پسند کرتے ہیں تو اسکا مطلب ہے کہ وہ جنرل ضیاء الحق کو بمعہ وردی اگلے پانچ سال کیلئے اپنے ملک کا صدر دیکھنا چاہتے ہیں یعنی جنرل ضیاء الحق اور اسلام ایک چیز ٹھہرے۔ لاحول وولاقوۃ۔ جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کئی مرحلوں پر ضرور اپنے آپ کو پاکستان سمجھتے تھے اور اپنے ہر مخالف کو خلافِ پاکستان یعنی غدار گردانتے تھے مگر اب تو انتہا ہو گئی تھی کہ دینِ اسلام جنرل ضیاء الحق کے مجسمہ روپ میں برآمد ہو رہا ہو، مگر یہ بات قائداعظم کے ملک کے اندر ہوئی۔ اس قائداعظمؒ کے ملک کے اندر جس نے اپنی شبانہ روز محنت سے برصغیر کے مسلمانوں کیلئے حقوق کے تحفظ اور آزادی کیلئے یہ ملک ایک عظیم سیاسی پرامن اور دستور جدوجہد سے حاصل کیا تھا۔ جہاں پر قوت اخوت عوام کا نظام جاری ہونا تھا اور اسلام کی عظیم تجربہ گاہ بننا تھا اور اس تجربہ گاہ سے جنرل ضیاء الحق کا بھوت نکل آیا اور اس نے اپنے آپ کو اسلام کہلوایا۔

اور پھر وہ ریفرنڈم ہوا جس کا عوام نے مکمل بائیکاٹ کیا اور وہ بائیکاٹ دیدنی تھا۔ پورے ملک میں اک سناٹا تھا۔ ریفرنڈم کے دن قریہ قریہ، شہر شہر ویرانی تھی۔ سرکاری ملازموں کے سوا کسی شہری نے اس میں حصہ نہیں لیا مگر جنرل صاحب نے دعویٰ یہی کیا کہ 90 فیصد ووٹروں نے حصہ لیا اور ان میں سے 99 فیصد نے اسلام کے حق میں یعنی جنرل ضیاء الحق کے حق میں ووٹ ڈالا ہے۔ شاید یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ تھا اور یہ جھوٹ سب سے زیادہ راست گو قائداعظم محمد علی جناح کے ملک میں بولا جا رہا تھا۔ یوں ایک فراڈ ریفرنڈم کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ آئندہ الیکشنوں کے بعد جو اسمبلی معرضِ وجود میں آئیگی اور مارشل لاء اٹھالیا جائیگا۔ اس

تاریخ سے آئندہ پانچ سال کیلئے جنرل ضیاء الحق ہی ملک کے با اختیار صدر رہیں گے، ان کے خیال میں یہ ایک عوام فیصلہ تھا۔

اسطرح جنرل ضیاء الحق کی حیثیت کو پختہ کرنے کے بعد ایک غیر جماعتی الیکشن کی سکیم بنائی گئی تاکہ آنے والی اسمبلی میں ممبران اپنی ذاتی حیثیت میں منتخب ہوکر آئیں۔ وہ کسی پارٹ لائن یا سوچ کے پابند نہ ہوں، صرف اپنی انفرادی حیثیت میں اور جنرل صاحب کے اشاروں پر ناچتے رہیں کیونکہ اس سکیم کے تحت آئندہ کے وزیراعظم کو نامزد کرنے کا اختیار بھی صدر صاحب ہی کے پاس رہ گیا تھا تاکہ جسے وہ چاہیں، اپنا کٹھ پتلی وزیراعظم رکھ لیں یا بدلتے رہیں اور ممبران اس نامزد وزیراعظم کے پیچھے لائن لگا کر کھڑے نظر آئیں، اس طرح ایک پابند اور تابعدار اسمبلی کا بندوبست کر لیا گیا تاکہ اصل اختیارات جنرل صاحب کے ہاتھ میں رہیں اور ایک جمہوری درشنی حکومت بھی معرض وجود میں آجائے۔

اسطرح ایک جرنیل نے اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر قائداعظم محمد علی جناحؒ کے جمہوری تصور پر استوار کئے ہوئے ملک کے اندر غیر جماعتی انتخابات کا ڈھونگ رچا کر ہر طرح کی نفسا نفسی کو رواج دیا۔ اب لوگ کسی پارٹی پروگرام یا نصب العین کے تحت اسمبلی کے ممبر نہیں بنتے تھے بلکہ اپنی دولت برادری مسلک قوت بازو یا غنڈہ گردی کے بل بوتے پر چنے جاتے تھے۔ اس ہتھکنڈے سے کیا کیا اخلاق باختگی رونما ہوئی تھی، وہ جائے بھاڑ میں جنرل ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے لوگ مطلوب تھے، جن کی موم کی ناک ہو، جب چاہی مروڑ لی اور یہ سب کچھ اسلام اور جمہوریت کے نام پر کیا جارہا تھا۔ کیونکہ اب جنرل صاحب کیلئے مزید اقتدار میں رہنے کیلئے اسکے سوا اور کوئی

چارہ نہیں رہ گیا۔ کچھ تو لوگ ہوں جو اپنے اپنے فائدے کی خاطر جنرل صاحب کی طرف لپکیں۔ یوں مفاد پرستی کی ایک کھچڑی پکانے کی تیاری شروع کردی گئی۔ ایم آر ڈی نے اس الیکشن کا بائیکاٹ کردیا کہ وہ اپنی اپنی جماعتی حیثیت کی خودکشی پر اپنے دستخط ثبت نہیں کرنا چاہتے تھے مگر لوگوں نے اسمبلی الیکشنوں کا اس موثر انداز میں بائیکاٹ نہ کیا، جس طرح کہ ریفرنڈم کا کیا تھا، اسلئے کہ لوگ اب مارشل لاء سے بہت زیادہ تنگ آچکے تھے اور وہ کوئی نہ کوئی نئی صورت اور راستہ ڈھونڈنا چاہتے تھے کہ شاید اسے میں سے کوئی خیر کی شکل نکل آئے۔ دوسرے اسمبلیوں کے الیکشن کیلئے مقامی سطح پر امیدواروں کے جوش و خروش اور بھاگ دوڑ سے بھی ذرا زیادہ گہما گہمی ضرور ہوتا تھی۔ دولت والے اس راستے سے عزت خریدنا چاہتے تھے اور غریب لوگ بھی اپنا پیٹ پالنا چاہتے تھے۔ ایم آر ڈی کی جماعتیں مفاد پرست ٹولہ اور عوام الناس کے اس پہلو کو نظر انداز کر گئیں۔ انہیں کیا معلوم کہ مقتدروں نے اپنے اپنے مذموم مقاصد کی خاطر پاکستانی معاشرے کو کس قدر اخلاق باختہ، خودغرض اور بقائے ذات کا غام بنا رکھا ہے۔ معاشروں کی اخلاقی تربیت اور انسانیت گری بھی ایک خاص سماجی ماحول اور اقتدار سے منسلک ہے۔ اگر ان اقتدار کی آبیاری نہ کی جائے اور اس کی جگہ تشدد اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کو زیادہ رواج دیا جائے تو اخلاقی قدریں دم توڑ جاتی ہیں اور یہاں تو سالہا سال سے کوڑے مار قانون و دستور شکن بربریت اور ننگی طاقت کا اک رقصِ ابلیس تھا جو مادرِ وطن کو اپنے چنگل میں لئے بسمل کی مانند تڑپا رہا تھا۔ اس ماحول سے کیا زعفران برآمد ہوتی۔ یہاں تو کشت ویران کے تمام بندوبست کرلئے گئے تھے اور پھر اس اخلاقی اجاڑ خانے سے وہی برآمد ہونا تھا جو 1985ء کے الیکشنوں کے

نتیجہ میں برآمد ہوا۔ جنرل صاحب نے اس ویران برآمدگی کا باقاعدہ منصوبہ بندی سے اہتمام کیا تھا اور اپنی مرضی کی ایک اسمبلی تشکیل دے لی تھی تاکہ انہیں کوئی کچھ نہ کہے اور وہ جو چاہیں اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر کروا سکیں۔ پوری دنیا کو یہ بھی کہہ سکیں کہ انہوں نے جمہوریت بحال کردی ہے۔ یوں جنرل صاحب نے پتلیوں کے کھیل سے دل بہلانے کیلئے قوم کے ساتھ ایک نہایت ہی خطرناک کھیل کھیلا تاکہ آئندہ آنے والے ان کے غلام سیاستدان اخلاقی سیاسی اقدار کی مضبوط کنکریٹ کی جگہ ہارس ٹریڈنگ کے محتاج ہوکر بدنام ہوتے رہیں اور جنرل صاحب اپنا کھیل کھیلتے رہیں۔ ملک نہ ہوا بلکہ بازیچہ اطفال تھا جو ایک جنرل کے بہلاوے کیلئے حاضر تھا۔

یرغمالی جمہوریت

ریفرنڈم کی ریاکاری اور ضیاء الحق کی شخصیت سے دین اسلام کی بدطنیت تطبیق کے بعد اخلاق سے عاری بلکہ اخلاق باختہ غیر جماعتی انتخابات سے پیدا ہونیوالی بے وقعت اسمبلیوں کو مزید بے دست و پا رکھنے بلکہ حرفِ غلط کی طرح سے مٹادینے کیلئے ظلمتِ حق کے عظیم ماہر نے ایک نیشنل سیکورٹی کونسل کا تصور پیش کیا، جس کے مطابق ریاست کے اصل اختیارات ایک ایسی غیر منتخب کونسل کے پاس رکھنا مقصود تھے جس کا دارالمہام ایک دفعہ پھر واحد شخص ہونا تھا جس اتنے زیادہ فریبی طریقوں سے صدر مملکت کا نام دیا گیا تھا اور وہ تھا جنرل محمد ضیاء الحق وہی شخص ابھی تک مع وردی کے چیف آف آرمی سٹاف بھی تھا۔ اس ایک شخص کے اختیارات کو مزید ریاکاری کا غلاف پہنانے کیلئے اسکے ساتھ ایئر اور نیوی چیف کو منتخب کر کے ان کی طفل تسلی یا تشفی بھی کرنا

مقصود تھی کہ کیوں نہ کونسل کے نام پر انکو بھی اس ارتکاز اختیار کی بغل میں لے لیا جائے جن کی تعیناتی وترقی اور برخاستگی کا مکمل اختیار صدر مملکت یعنی چیف آف آرمی سٹاف یا بالالفاظ دیگر جنرل محمد ضیاء الحق خادم اعظم کے پاس ہی رہنا تھا۔ بے دست و پا اسمبلی کے اندر سے منتخب نہیں بلکہ نامزد وزیراعظم یعنی ضیاء الحق کے غلام وزیراعظم کو اس کونسل کا محض ایک ممبر ہونے کا شرف حاصل ہونا تھا۔ یہ تھی وہ عظیم نیشن سیکورٹی کونسل جسے ملک وملت اور قائداعظم کے بنائے ہوئے جمہوری پاکستان کی تشکیل پالیسی میں کلیدی حیثیت حاصل ہونا تھی۔ کونسل تو محض ایک نام تھا۔ اصلی قوت تو محمد ضیاء الحق ہی کے پاس رکھنا مقصود تھا۔ اس کونسل کے فیصلے یعنی جنرل محمد ضیاء الحق کے فیصلے پھر اس بے دست و پا اسمبلی کے اندر سے تخلیق شدہ حکومت اور اسکی کابینہ پر غالب رکھنے تھے۔ پوری پارلیمینٹ کو اس کونسل کے فیصلوں کی باندی بننا تھا۔ یہ تھا جنرل محمد ضیاء الحق کا تصور بحالی جمہوریت جس کیلئے وہ اپنیا قتدار کی بندگلی میں پہنچ کر مجبور ہوا تھا اور اب اہل پاکستان پر ایک احسانِ عظیم کرنے کو تڑپ رہا تھا۔ ہائے رے نشاط ہوس۔ ہوس اقتدار ملک رہے نہ رہے، ملک کے عوام رہیں نہ رہیں، ملک کے باشندوں کو آزادی ملے نہ ملے، لوگوں کے حقوق کی پاسداری ہو نہ ہو، مگر ایک بالادست گروہ اور اسکیبالادست سربراہ کو ہر صورت اختیار ضرور ہی ملنا چاہیئے کہ ملک کی سلامتی کا تقاضا ہے۔ اسے کہتے ہیں منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ ضیاء الحق بول رہا تھا۔

اگر قائداعظمؒ ایسے عظیم جمہوریت پسند بلکہ جمہوریت پرست کے بنائے ہوئے ملک کو اسی قسم کی باندی جمہوریت واپس ملنت تھی تو پھر اتنے تکلف کی کیا

ضرورت تھی۔ اقتدار کی بے حد وحساب خواہش پر اتنے زیادہ غلاف کیوں چڑھائے جارہے تھے۔ اسلئے کہ اس کے بغیر بات بنتی تھی، بازار میں سودا بیچنے کیلئے کچھ نہ کچھ بناؤ سنگھار کرنا ہی ہوتا ہے اور نیشنل سیکورٹی کونسل اس غازے اور پاؤڈر کا نام تھا جو اقتدار کی طوائف کیلئے ضروری تھا، وگرنہ وہی کرختگی کی سطور سے بھرا ہوا چہرہ کون پسند کریگا مگر اس سارے اہتمام کے باوجود اس جی حضور اسمبلی نے بھی اپنی یہ خودکشی پسند نہ کی کہ اجماع اشخاص کی پھر اپنی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ اس جی حضور اسمبلی نے بھی جرنیلی جکڑ بندی سے بچنے کیلئے جنرل صاحب کی واضح خواہش کے باوجود کہ خواجہ صفدر کو اس اسمبلی کا سپیکر بنا جائے لیکن اسمبلی نے سید فخر امام کو سپیکر چن لیا اور جنرل ضیاء الحق اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ مگر اب ذرا پیچھے جانا محال تھا۔ اسلئے سوچا کہ چلو گذارہ کرتے ہیں۔ اسکے بعد اس یرغمالی اسمبلی ہی نے نیشنل سیکورٹی کے اس بھیانک تصور کو ماننے سے یکے بعد دیگرے عذر پیش کرنے شروع کر دیئے۔ اس مقام پر آ کر جنرل صاحب کو کچھ ہچکولے گنے شروع ہوئے کہ سوچا کچھ اور تھا مگر ہو کچھ اور رہا ہے، اندرون ملک ہی نہیں، بیرون ملک کے حالات بھی ایک ایسے ہی تھے کہ اب واپسی کا راستہ مشکل تھا۔ لہذا جنرل صاحب کو اپنی اقتداری افواج کو پیچھے ہٹانے ہی میں خیریت محسوس ہوئی اور وہ پسپائی اختیار کر کے آٹھویں دستوری ترمیم کی پوزیشن میں آ کر کھڑے ہو گئے جس کے مطابق تمام کلیدی ریاستی اختیارات صدر صاحب یعنی جنرل ضیاء الحق ہی کے ہاتھ میں رکھنے مقصود تھے۔ اس بے رحم ترمیم کے مطابق صدر جب چاہے اسمبلی برخواست کر سکتا تھا اور حکومت کی چھٹی کر سکتا تھا۔ تینوں سربراہاں افواج ایئر فورس، نیوی اور چیئرمین چیفس آف سٹاف، چیف الیکشن کمشنر، چیف جسٹس

اور دوسرے کلیدی حکومتی عہدوں کی تعیناتی و ترقی کا اختیار وزیر اعظم کے بجائے صدر کے ہاتھ میں رکھنا مقصود تھا۔ یعنی پاکستان کی حکومت کا چیف ایگزیکٹو اب وزیر اعظم نہیں بلکہ صدر کو بننا تھا۔ وزیر اعظم کابینہ اور پارلیمنٹ سب درشنی ہونے تھے۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس باندی اسمبلی نے جنرل صاحب کی اس خواہش کو بادلِ نخواستہ قبولیت بخش دی، وگرنہ وہ ملک سے مارشل لاء اٹھانے کو تیار نہیں تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ 1985ء کے آخری دن تک ملک پاکستان کے اندر مارشل لاء بھی تھا اور اسمبلیاں بھی تھیں۔ اور پھر آٹھویں ترمیم کی سودے بازی یا ڈھٹے بازی کے بعد جنرل ضیاء الحق صاحب نے ملک وملت پر کرم فرماتے ہوئے 31 دسمبر 1985ء کو ملک سے مارشل لاء اٹھالیا اور ایک یرغمالی جمہوریت کا آغاز کیا۔ جس کا وزیر اعظم اور صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بے بس و بے اختیار تھے۔ جنہیں ہاتھ باندھ کران کے اپنے ممبران اسمبلی کی بے جا خواہشات اور مطالبات کے طوفان کے سامنے ڈال دیا گیا کہ بیٹا جاؤ اور ہارس ٹریڈنگ کرو تاکہ تم اور تمہارے جمہوری ساتھ خوب بدنام ہوں اور پاکستان کے عوام پھر ہماری ہی طرف ایک نجات دہندہ کے طور پر متوجہ ہوں۔ واہ جنرل ضیاء الحق تیرا جواب نہیں۔ کیا خوبصورت حکمت عملی تراشی کہ جمہوریت بھی بحال ہوگئی اور اختیارات بھی وہی رہے جہاں رہنا مقصود تھے۔ مزے جنرل صاحب کے اور سر درد جونیجو صاحب کیلئے۔ کیا خوبصورت تقسیم کاری تھی، انکی چالاکی کو داد دیئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔

مگر ان تمام جرنیلی احتیاطوں اور پیش بندیوں کے باوجود وہ بھول گئے کہ سیاسی عمل کے کچھ اپنے فطری تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ انسان ذاتی ہی نہیں گروہی

نفسیات اور اسکے تراشیدہ رویوں کا بھی گلام ہے۔ اسمبلی ہو یا جلسہ جلوس کچھ منطق کچھ اصول کچھ چالاکی، کچھ اصلیت اور کچھ درشتیت سب کو ساتھ ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ جمہوریت کے دعوے کے ساتھ اظہار خیال کی راہوں کو تمام تر کراہت کے باوجود کھلے رکھنا پڑتا ہے۔ جس میں خاص طور پر ابلاغ عامہ از قسم اخبارات وغیرہ کا بڑا کردار ہوتا ہے اور پھر انہیں ایک دفعہ کھلا چھوڑ کر واپس پابند بنانا بھی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہی صورتحال اعلیٰ عدالتوں کی ہوتی ہے کہ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی راہیں خود کھول لیتی ہیں۔ سو یا ہوا قانون اور قانونی تنقیحات بیدار ہو جاتے ہیں۔ جج ہی نہیں بار کی گروہی حس بھی جاگ اٹھتی ہے۔ اسی طرح سیاسی جماعتیں بھی سیاسی تقاضوں سے زیادہ دور نہیں رہ سکتیں۔ اختلاف رکھنے والی جماعتیں ہی نہیں بلکہ فرمانبردار جماعتیں بھی اپنی گروہی نفسیات سے باہر نہیں آسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل صاحب کہ خود اپنے گیر جماعتی اینٹ روڑے کو ایک سیاسی جماعت کی شکل دینا پڑی کہ اس کے بغیر کوئی سیاسی عمارت بن ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے حضرت قائداعظم کی عظیم جماعت کا عظیم نام ان اینٹ روڑوں پر دسپاں کر دیا مگر وہ یہ بھول گئے کہ آگے جا کر شاید اس نام کی بھی کچھ لاج رکھنی پڑیگی، اور جنرل صاحب کی سفلی کو اہشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ مزدور اور طلباء انجمنیں بھی کچھ ایسی کیفیت سے گذر رہی تھیں اور اب ان سب باتوں یا طوفانوں سے نبٹنا محمد خان جونیجو اور اسکے وزرائے اعلیٰ کا کام تھا اور جنرل صاحب اور اسکے ساتھیوں کا کام تھا۔ تماشا دیکھنا کیونکہ اہل کرم کا ہمیشہ سے ہی یہی وطیرہ رہا ہے:-

؎ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اس بر غمالی جمہوریت کا سب سے پہلا کڑا امتحان اس وقت ہوا جب بے نظیر بھٹو نے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ 10 اپریل 1986ء کو لندن سے لاہور آمد کا پروگرام بنایا۔ جنرل ضیاء الحق نے سوچا کہ اسلام آباد میں بیٹھ کر اسلام آباد میں بیٹھ کر کیوں نہ تماشا دیکھا جائے کہ یہ جمہوری لوگ از قسم جونیجو اور نواز شریف اس معاملہ کو کس طرح ہینڈل کرتے ہیں۔ جونیجو اور نواز شریف نے اس طوفان کے متعلق اپنے اپنے تخمینے لگوائے تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ طوفانِ نوح ہے۔ ایک نکتہ نگاہ تھا کہ اس کے آگے بند باندھا جائے اور دوسرا نکتہ نگاہ تھا کہ اس طوفان کو بہہ لینے دیں وگرنہ بند ٹوٹ جائینگے اور نقصان زیادہ ہوگا۔ جنرل صاحب سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے نہایت بے نیازی سے کہا کہ میں ان معاملات میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا اور ایک ضعیف سی طنز کے ساتھ کہا کہ آپ حکمران ہیں جو چاہیں فیصلہ کریں مگر دیکھنا میری آٹھ سالہ محنت ضائع نہ کر دینا۔ آخری بات دراصل ان کے اندر کی چالاکی کی حاشیہ آرائی تھی، انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ بلیوں کا تماشا ایک حد تک ہی جا سکتا ہے۔ حدیں ٹوٹ جائیں گی تو بندر پھر درمیان میں کود سکتا ہے اور اسوقت اس اچھل کود کا کوئی جواز بھی ہوگا۔ ان کی یہ عالی شان بے نیازی دراصل ایک زبردست جامع حکمت عملی کا حصہ تھی کیونکہ سیاسی گروہ اپنی لڑائی کو کچھ زیادہ ہی بڑھا لیں تو کھیل بڑی آسانی سے اصل مقتدروں کے پاس پھر واپس آجاتا ہے اور یہی ان کی گیم تھی۔ 10 اپریل 1986ء کو بے نظیر بھٹو لندن سے لاہور آئیں اور انکا استقبال ہزاروں لاکھوں انسانوں نے نہایت والہانہ انداز میں کیا۔ سارا شہر لاہور سڑکوں پر تھا۔ مقتدروں کے

ایوان بندر ہے۔ اندیشہ ہائے دور دراز کے حاکموں کے سر چکرائے۔ خردمندوں نے سر جوڑے اور دیوانوں نے دھمال ڈالی مگر تازہ تازہ جمہوریت کے یرغمالی حکمرانوں نے پاس اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پولیس اور انتظامیہ نے ادھر ادھر منہ پھیر لیا اور پیپلز پارٹی نے نظم وضبط دکھایا اور پھر سارا ہنگامہ نہایت پراسرار خاموشی میں بدل گیا۔ اسکے بعد بے نظیر بھٹو نے سارے پاکستان کا اسی قسم کا دورہ کیا اور ہر جگہ یہی طریقہ اپنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ باندی ہی سہی، مگر اس بندھی بندھائی جمہوریت نے پھر بھی میدان مارلیا۔ کچھ "محبانِ وطن" کے لئے یہ منظر بہت ہی سوہانِ روح تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اقتدار کی غلام گردشوں میں ایک زہریلی سرگوشی سینہ بہ سینہ پھیلی کہ نواز شریف ایک امیری آدمی ہے، اس نے کسی طرح سے جہانگیر بدر صدر پیپلز پارٹی پنجاب کو خرید لیا ہے تاکہ یہ طوفان بخیریت گذر جائے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط تھی مگر سازشیوں کا اپنا ایجنڈا ہوتا ہے اور حالات کا اپنا دھارا ہوتا ہے۔ اس بہاؤ میں آ کر کچھ کردار پھنس جاتے ہیں اور ہمارے ہاں وہ کردار اب جونیجو اور نواز شریف تھے۔ جنرل ضیاء الحق اور بے نظیر بھٹو کے تضادات اور فسادات اپنی جگہ مگر اب اصل امتحان جونیجو اور نواز شریف کا تھا۔ پہلا امتحان پاس کر گئے مگر اسی کامیابی نے اندرونِ خانہ سازشیوں کے دروازے کھول دیئے کہ یہ لوگ کہیں زیادہ ہی پاؤں نہ جما لیں۔ اس دن کے بعد کھیل کے رنگ اور چالیں ذرا اور ہی تھیں اور بہت ہی پیچیدہ تھیں۔ اب فکر لاحق ہوگئی کہ کہیں یہ بی بی جمہوریت واقعی جڑیں ہی نہ پکڑ جائے اور ملکی سلامتی اور اسلام کیلئے ہماری خدمات کہیں اکارت ہی نہ چلی جائیں۔ کھیل کا یہ باب ضیاء الباطل کی مارشل لائی شبِ ظلمت سے بھی بڑھ کر بھیانک تھا۔

یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، میں نے اس بارے میں کچھ تفاصیل اپنی انگریزی کتاب فرد جرم دیدی ہیں، یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ جونیجو، نواز شریف اختلافات کی داستان اس افسانہ ہی کا شاخسانہ تھے اور اس کی ایک شاخ وہ ہے جو چوہدری پرویز الٰہی محمد نواز شریف کے درمیان رسہ کشی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس جھگڑے کے دوران جنرل ضیاء الحق عجیب و غریب انداز میں اس کو شہہ دیتے رہے اور ایک بے اعتنائی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرتے رہے، جب ان دو سیاسی پہلوانوں میں سے ایک جیت جائے اور دوسرا چت ہو جائے۔ اور جب اس کشمکش میں نواز شریف جیت گیا تو اس کے پورے چھ دن بعد لاہور آ کر ضیاء الحق نے اپنا معروف بیان داغ دیا کہ نواز شریف کا کلہ مضبوط ہے۔ لوگوں کو یاد ہی نہیں کہ جنرل ضیاء الحق کا یہ بیان بعد از جیت 29 اکتوبر کا ہے اور نواز شریف جنگ کھلے اعتماد کا ووٹ لیکر 23 اکتوبر 1986ء کو جیت چکا تھا۔ آپ اسے جنرل صاحب کی حکمت عملی کہہ لیں مگر انکی چالاکی کو داد ضرور دیں۔ یوں جیتنے والا ان کی جیب میں تھا، شاید پہلے بھی تھا مگر اب کچھ زیادہ ہی تھا۔

پاکستان کے اندر جمہوریت اگرچہ آمریت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھی مگر اپنے عمل اور طرز عمل میں وہ مارشل لاء سے مختلف ضرور تھی کیونکہ اسے اپنے نام کا بھی بھرم رکھنا تھا۔ پریس اور اعلیٰ عدالتوں کے سامنے بھی ان کی حیثیت مارشل لاء کی طرح شاہانہ نہیں بلکہ کبھی عاجزانہ اور کبھی شاطرانہ تھی۔ اسلئے ہر صورت میں اندازِ حکمرانی ضرور بدلنا پڑ رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان مارشل لائی زمانے کی ویزے والی کیفیت ختم ہوگئی اور خطرناک سیاستدانوں

کی باہمی صوبائی آمدورفت شروع ہوگئی۔ جلسے جلوس پر پابندیاں بھی ڈھیلی پڑ گئیں، طلباء اور مزدور انجمنیں بھی اب ذرا زیادہ کھل کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگ گئیں۔ دفعہ 144 کا استعمال ذرا کم ہوگیا، یہاں تک کہ ایم آر ڈی کو اس دور میں ایک دفعہ پھر ایک تحریک چلانے کا موقع مل گیا جہاں نہ گولی چلی اور نہ ہی ٹیئر گیس چلی۔ ہیلی کاپٹر ارے اور نہ ہی لاشیں گریں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتنے طویل عرصہ سے بند بھڑاس لوگوں کے دلوں سے نکلنا شروع ہوگئی۔ صوبہ سندھ میں اب وہ تلخی جو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی سے پیدا ہوئی تھی، اس میں واضح کمی آنا شروع ہوگئی۔ وہاں قتل و غارت اور ڈاکوں ہی میں کم واقع نہیں ہوئی بلکہ ریل اور روڈ ٹرانسپورٹ بغیر کسی پولیس کانوائے کے صحیح سلامت چلنا شروع ہوگئی اور یوں دلوں کی وہ دوریاں جو مارشل لاء دور میں پیدا ہوگئی تھیں یا پیدا کردی گئی تھیں، وہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوگئیں اور یرغمالی جمہوریت ہی کے دور میں امن وامان بہتر ہونا شروع ہوگیا۔ دراصل امن عامہ کا تعلق معاشرے کی پوری نفسیات سے ہوتا ہے، اگر اسکے اندر کھچاؤ زیادہ پیدا ہوجائے تو امن عامہ درہم برہم ہوجاتا ہے اور اگر ذرا تسکین قلوب کی حالت ہو تو غم وغصہ کے شعلے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ کسی خوفناک جبر کے ساتھ جیسا کہ مارشل لاء کی صورت ہوتی ہے، امن عامہ بہتر ہوتا ہے، وہ بہت بڑی غلطی پر رہوتے ہیں۔ امن کا تعلق معاشرتی وقانونی عدل سے ہے، جبر سے نہیں۔ جبر اتنا ہی مفید ہوتا ہے جو عدل کے اصولوں کے تحت ہو۔ جب بھی وہ ان قانونی حدود سے بڑھے گا، وہ جبر بھی ظلم بن جاتا ہے۔ ظلم تو بڑھتا ہی مٹنے کیلئے ہے، ظلم آخر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ جنرل صاحب کی ہزار

خواہش کے باوجود ان کا چہیتا اور مفید مارشل لاء آخر کار ناکامی کی آخری حد تک پہنچ کر ایک بند گلی میں پہنچ گیا تھا اور باندی جمہوریت کی مراجعت کرنا پڑی تھی۔ اس باندی جمہوریت ہی کی برکت تھی کہ اب لاء اینڈ آرڈر بہتر ہو رہا تھا۔ جیلیں ٹوٹنا بند ہو گئیں، ڈاکے بھی کم ہو گئے، قتل و غارت مدہم پڑ گئی اور جلسے جلوس کے اذنِ عام سے لوگوں کے دل ٹھنڈے ہو گئے تھے یا کم از کم ٹھنڈے ہونا شروع ہو گئے۔ دراصل جمہوری اندازِ حکمرانی معاشرے کو ٹھنڈا اور منظم رکھنے کا ایک شاطرانہ طریق کار ہے اور یہ چالاکی اب کچھ نہ کچھ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

اس اچھے پہلو کے ساتھ ساتھ غیر جماعتی انتخابات کے نتیجہ کی خرابیاں بھی سامنے آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بہت بڑی خرابی ہارس ٹریڈنگ کی تھی۔ ملک کا وزیراعظم اور صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اسمبلیوں کے ذاتی حیثیت میں چنے جانے والے ایم این ایز اور ایم پی ایز کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے تھے۔ جہاں یہ نمائندے اپنے عوام کے فائدے کے کاموں سے کہیں زیادہ اپنے ذاتی کاموں اور مفادات کے حصول کیلئے دباؤ کا ایک ٹولہ بنے نظر آ رہے تھے۔ وہ سرکاری پلاٹ اور زمین اونے پونے میں الاٹ کرواتے، اسلحہ کے بے شمار لائسنس بنواتے اور اپنی مرضی کے تحصیلدار، تھانیدار اور ڈی سی اور ایس پی تعینات کروا کر ایک غیر جانبدارانہ انتظامیہ اور پولیس کی بجائے ایک ذاتی منشا کی انتظامیہ اور پولیس بنوا کر اپنی اپنی ذاتی حیثیت کو مشید مضبوط کر رہے تھے۔ اس صورتحال میں حکومتی حیثیت منصف سے کہیں زیادہ گروہی بننی شروع ہو گئی۔ جس کی ساری روسیاہی وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کے کھاتے میں جا رہی تھی۔ اور بہت سے لوگ خاص طور پر پیپلز پارٹی والے کلبلا رہے

تھے۔ یہ سارا الزام پھر بی بی باندی جمہوریت پر آرہا تھا، حالانکہ ان کی اصل جڑ جنرل ضیاء الحق کی غیر جماعتی انتخابات کی ترکیب اکسیر تھی جو انہوں نے بند گلی سے نکلنے کیلئے اپنائی تھی۔ واقعی لوگوں کی یادداشت بہت کم ہوتی ہے اور لوگ جنرل ضیاء الحق کو اس خرابی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا رہے تھے۔ تمام گالیاں اب جمہوریت اور اس کے سرکردہ لوگوں کو پڑ رہی تھیں اور یہی جنرل صاحب چاہتے تھے کہ بیرک کی عافیت اور مورچے میں بیٹھ کر حکومت بھی کی جائے، اختیارات بھی اپنے پاس رکھے جائیں مگر بدنامی سیاستدانوں کے حصہ میں آئے۔ اسے کہتے ہیں کہ گرینڈ سٹریٹجی یا عظیم حکمت عملی، واہ جنرل صاحب! ملک وملت جائے بھاڑ میں، ان پر انگلی نہ اٹھے۔ اور یہ سارا کچھ ایک عظیم مخلص قائد کے ملک میں ہو رہا تھا جس کا زندگی بھر کا خاص خاصہ دستور و قانون اور اخلاق، اسلامی اصولوں کی بالادستی رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہر طرح کی مخالفت کے باوجود ایک دفعہ بھی کوئی غیر قانونی حرکت کئے یا لغزش سرزد ہوئے بغیر ایک قوم ہی نہیں بنائی تھی بلکہ مملکت بھی دستوری طریقوں سے حاصل کر لی تھی۔ مگر بعد میں ان ہی کے ملک کے اندر جرنیلوں اور نوکر شاہی نے شب خون مار کر جمہوریت بھی دفن کر دی اور ساتھ ہی اصول بھی۔ قوم کو تقسیم در تقسیم کیا اور اس کج روی کا نام حکمت عملی رکھ لیا اور اسے کامیابی اور سرخروئی کے نام سے بھی نوازتے رہے بلکہ اب تک نواز رہے ہیں۔ واہ سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں سچائی کے سر پر ہتھوڑا مارنا۔

ان تمام تر خرابیوں کے باوجود مجموعی طور پر لوگ مارشل لاء کے مقابلے میں اس لولی لنگڑی اور غیر جماعتی انتخابات کی وجہ سے مریض جمہوریت سے پھر بھی زیادہ خوش تھے۔ اگر خوش نہیں تھے تو کسی حد تک مطمئن ضرور تھے اور یہ بات جنرل ضیاء الحق

کیلئے سوہانِ روح تھی۔ اتنے میں جمہوریت نے اپنے طرزِ عمل کے طریق سے مجبور ہوکر جنرل صاحب کی عظیم حکمت عملی تقسیم کرواور حکومت کرو، پہ ایک اور سب خون مارا جس سے جنرل صاحب غصہ سے آگ بگولہ ہوگئے۔ محمد خان جونیجو نے افغانستان کے حوالے سے1988ء میں اسوقت آل پارٹیز کانفرنس بلالی، جب روس نے عندیہ دیا کہ وہ افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنے کیلئے تیار ہے اور وہ امریکہ اور پاکستان سے ضمانت چاہتا ہے کہ وہ ان کی واپسی کیلئے حتی المقدور امن وحفاظت کی ضمانت دے۔ پچھلے ایک عرصے سے اسی لمحہ کا تو انتظار تھا۔ جب سے روس افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا، اسوقت سے پاکستان اپنے برادر اسلامی پڑوسی کی ہر طرح سے مدد کررہا تھا اور اس مدد کی بہت سی صورتوں میں بہت بڑی قیمت بھی ادا کررہا تھا۔ امریکہ بھی اسی دن کے انتظار میں تھا کہ کسی طرح روس ہزیمت اٹھا کر باہر نکل جائے۔ مانا کہ یہ معاملہ ہمہ جہتی تھا اور اسکے اور بھی بہت سے پہلو تھے۔ مگر یہ امر کہ اب روس نکلنا چاہتا ہے، ایک بہت ہی مبارک اور مفید موقع تھا۔ لہٰذا اب پاکستان کو کیا کرنا چاہئے، ایک قومی مسئلہ تھا تو کیوں نہ قوم کی تمام نمائندہ جماعتوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور ایک قومی پالیسی کا فیصلہ کرلیا جائے۔ لہٰذا محمد خان جونیجو نے تمام سیاسی جماعتوں کو اس مسئلہ پر مشورے کیلئے دعوت دیدی جس میں لامحالہ پی پی پی کی بینظیر بھٹو کو بھی شامل کرنا ضروری تھا۔ اس قومی اتحاد سے جنرل صاحب خائف ہوگئے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب قوم اکٹھی ہوجائیگی تو پھر ان کی ضرورت نہیں رہ جائیگی۔ جنرل صاحب کی بقاء یا سیاسی بقا کی بنیاد ہی قومی نفاق ہے، اگر نفاق کی جگہ اتفاق ہوجائے تو پھر ان کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ جونیجو صاحب کی اس قابلِ اعتراض حرکت سے سخت ناراض ہوگئے

اور دل ہی دل میں بہانے تراشنے شروع کر دیئے کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس پر پرزے نکالتی جمہوریت ہی کی چھٹی کر دی جائے۔ دراصل آمریت اور جمہوریت میں ایک بنیادی جوہری فرق ہوتا ہے۔ آمریت ہمیشہ قوم کی تقسیم سے پرورش پاتی ہے اور اسکی بنیادی انرجی تقسیم کرو حکومت کرو ہوتی ہے۔ اب جمہوریت کے کس دور اور کس نسل میں یہ بات کس سطح تک کامیاب ہوتی ہے۔ وہ ایک الگ بحث ہے، مگر بنیادی مزاج اور سمت یہی ہوتی ہے۔ اب جنرل ایسی خطرناک بات کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اب جونیجو اور جمہوریت چاہے وہ یرغمالی ہی کیوں نہ تھی، اسکی چھٹی کا وقت آگیا تھا۔ صرف مناسب لمحے کا انتظار تھا۔

اور وہ لمحہ اوجڑی کیمپ کے حادثہ نے مہیا کر دیا۔ اوجڑی کیمپ ایک فوجی احاطہ کا نام ہے جو اسلام آباد اور راولپنڈی شہر کے عین گنجان آباد علاقہ کے درمیان واقع ہے اور وہاں پر آئی ایس آئی نے بہت سا جدید اور مہلک اسلحہ نہایت بے احتیاطی سے سٹور کیا ہوا تھا۔ اس اسلحہ میں جدید خطرناک میزائل تک بھی موجود تھے۔ انہیں وہاں سے افغانستان پہنچایا جاتا تھا۔ 10 اپریل 1988ء کو اس سٹور میں آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام آباد اور راولپنڈی شہر پر میزائلوں کی زد میں آ کر مارے گئے، سینکڑوں مکان تباہ ہو گئے اور لوگ شدید زخمی ہو گئے۔ بس سمجھئے کہ اک قیامت تھی جو انشہروں پر ٹوٹ پڑی۔ جونیجو کابینہ کے ایک سابق وزیر خاقان عباسی بھی ان ہلاک ہونے والوں میں سے ایک تھے۔ اس پر لازمی تھا کہ ایک عوامی واویلا اٹھ کھڑا ہوتا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس عوامی طوفان کو تھامنے کیلئے محمد خان جونیجو نے ایک پارلیمانی انکوائری کمیشن تشکیل دیدیا تاکہ کچھ سچ معلوم ہو سکے اور کچھ عوامی طوفان تھم

جائے۔ مگر جنرل صاحب اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی اپنی مخلوق پارلیمنٹ اوران کے جرنیلوں کی انکوائری کرے۔ میری بلی اور مجھے ہی میاؤں والی بات تھی۔ اب محمد خان جونیجو نے اپنی اس حرکت سے کفر کی تمام حدیں ہی پھلانگ دی تھیں۔ لہٰذا اب کچھ کرنا ضروری تھا۔

اور وہ عظیم کارِ خیر 29 مئی 1988 کی شام کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے آٹھویں دستوری ترمیم کے اختیارات کا سہارا لیکر اپنی ہی پیدا کردہ اسمبلیاں ختم کر دیں۔ جونیجو کی حکومت کی یہ کہہ کر چھٹی کر دی کہ انکی حکومت کرپٹ تھی اور اسلام نافذ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ یہ سن کر لوگ یکدم سکتے میں چلے گئے کیونکہ محمد خان جونیجو کچھ بھی تھے، کم از کم بے ایمان نہیں تھے، کرپشن کا الزام ان پر نہیں لگ سکتا تھا۔ انہوں نے تو ایسے الزامات کی بناء پر اپنے کئی وزیروں تک کی چھٹی کرادی تھی جن کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔ مگر جنرل صاحب کو ان سچائیوں سے کیا تعلق تھا، وہ تو اپنے پیرو مرشد ایوب خان کی باطل راہوں کے شہ سوار تھے، جن کی کتاب میں تو خواجہ ناظم الدین اور سہروردی جیسے فرشتے بھی ابلیس ہی لکھے جاتے ہیں، یہ محمد خان جونیجو کس باغ کی مولی تھی۔ رہی بات اسلام کے نفاذ کی تو وہ تو کو د جنرل صاحب نے اپنے طویل دور مطلق العنانی میں نافذ نہیں کیا تھا یا نہ کر سکے تو یہ بے چارہ محمد خان جونیجو کیا کر لیتا۔ مگر جنرل صاحب کو اس منطق سے کیا غرض۔ بات صرف اتنی تھی کہ جنرل صاحب کو کوئی مائی کالال ڈسمس نہیں کر سکتا تھا تو پھر ان پر الزام کیسے لگتا، الزام تو ہمیشہ اس پر لگنا ہوتا ہے جسے ڈسمس کیا جا سکے۔ جنرل ضیاء الحق ہو یا جنرل ایوب خان، سب سے زیادہ کرپشن انکے دورِ حکومت میں ہی نمایاں اور جوان ہوئی ہے، مگر

الزام ہمیشہ سیاستدانوں پر ہی لگتا ہے۔ ملک کے اصل مالکان عوام اس کذب گوئی پر حیران بھی ہوتے ہیں اور احتجاج بھی کرتے ہیں مگر وہ کسی جنرل کو ڈمس نہیں کر سکتے۔ وہ پھر اک تماشا بن کر رہ جاتے ہیں اور اگر وہ اپنے سیاستدان حکمرانوں کو اپنے ووٹ کے ذریعہ ڈمس کرنیکی طرف بڑھ رہے ہوں تو کوئی نہ کوئی جرنیل آگے بڑھ کر اس سبو کو خود ہی اٹھالیتا ہے اور عوام کو طویل جدوجہد کی عقوبتوں سے بچا کر ان کے ناپسندیدہ سیاستدان کی چھٹی کرا کر ان پر احسان جتالیتا ہے اور یہ احسانِ عظیم جنرل صاحب نے 29 مئی کو کر دیا اور پاکستان کو ایک دفعہ پھر بچالیا۔

جونیجو صاحب والے تجربے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اس یرغمالی جمہوریت سے بھی توبہ کر لی، کیونکہ اس میں قوم کے ایک ہو جانے کے خدشات بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ وہ قومی اتحاد جس کی تلقین بانی ملت نے 11 اگست 1947ء کی تقریر میں کی تھی، یہ جمہوری قسم کے بدبخت لوگ اپنے بابا کے سبق سے پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ آل پارٹیز کانفرنس قسم کے ڈھونگ رچا لیتے ہیں۔ ان سے دوری ہی بہتر ہے، اگر انہیں سیاسی عمل کا موقع مل گیا تو یہ بدبخت تو قوم کو ایک کر لیں گے اور یوں سب کا بیڑا غرق کر دینگے۔ بہتر ہے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کیوں نہ صدارتی نظام واپس لایا جائے۔ وہ پیارا صدارتی نظام جس کی بناء پر جنرل ایوب خان نے نہایت کامیابی سے ملک کو توڑ لیا تھا، اب ایک دفعہ پھر اس نسخہ ہی کو کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جنرل صاحب ابھی اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھے کہ انہیں موت نے بہاولپور کے قریب ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں آلیا جو ایک فوج تقریب کے بعد پیش آیا، جہاں ان کے سیکنڈ ان کمان جنرل اسلم

بیگ بھی پہنچے ہوئے تھے۔ حیرانی کی بات ہے کہ جب جنرل ضیاء الحق حادثہ کے بعد اپنے ہی جہاز کی آگ میں جل رہا تھا تو جنرل اسلم بیگ نے وہاں ٹھہر جانے کے بجائے اپنے علیحدہ چھوٹے جہاز سے راولپنڈی کے لئے دوڑ لگادی اور اپنے کمانڈر کو وہیں جلنے دیا۔ اس غیر معمولی دوڑ کی وجہ اقتدار پر قبضہ مقصود تھا، مگر اس بہت ہی عاجلانہ دوڑ کی وجہ سے پورے پاکستان میں یہ افواہ عام ہوگئی کہ جنرل ضیاء الحق کو جنرل اسلم بیگ نے مروادیا ہے اور وہ حکومت پر قبضہ کرنے کیلئے جنرل ضیاء الحق کو جلتا چھوڑ کر راولپنڈی کی طرف بھاگ اٹھا ہے۔ یہ افواہ منٹوں سیکنڈوں میں پھیل گئی اور خود فوج کے اندر بھی یہی تاثر عام ہوگیا جس سے ایک خطرناک صورتحال اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر انگلی جنرل اسلم بیگ کی طرف اٹھ رہی تھی۔ لہٰذا وہ ڈر گیا کہ اگر اب میں نے اقتدار پر قبضہ کیا تو پھر خیر نہیں ہے۔ یہ تھا وہ خوف، سچ یا جھوٹ یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ جس نے ملک کو ایک اور مارشل لاء سے بچالیا، وگرنہ مارشل لاء کے لئے سب تیاری موجود تھی۔ وہ نازک تین گھنٹے جن کا ذکر روئیداد خان صاحب اتنی حسرت کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ہیں، وہ تین گھنٹے اسی ادھیڑبُن میں گذر رہے تھے۔

جنرل ضیاء الحق مر گیا اور اسلم بیگ بوجوہ مارشل لگا نہ سکا۔ اب کیا کیا جائے؟ چلئے بی بی جمہوریت کو چلنے دیتے ہیں کہ مجبوری ہے۔ غلام اسحاق خان چیئرمین سینیٹ حسب دستور صدر بن گئے اور جنرل اسلم بیگ چیف آف آرمی سٹاف بن کر ریاستی قوت کے امین ٹھہر گئے۔ اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر جنرل ضیاء الحق کا ایک سیاسی بت تراشا گیا اور مفاد پرست ٹولہ نے انکے نقش قدم پر چلنے کی قسم اٹھائی بلکہ ان کا باقاعدہ مزار فیصل مسجد اسلام آباد کے صحن میں بنالیا گیا جہاں ہر سال 17

اگست (یومِ حادثہ) کو میلہ لگتا ہے، تا کہ انکی عظیم قومی خدمات کا ذکر ہوتا رہے اور تقسیم کرو، حکومت کرو کے گرو کو کوئی بھول نہ جائے۔

مقتدروں کا کھیل

آپ نے دیکھا کہ حالات کی مجبوری کے تحت ملکی بقا کی اکسیر دوا مارشل لاء تو نافذ نہ کیا جا سکا۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ پاکستان کے احمق عوام کہیں کسی سیاسی جماعت کو اتنی غالب اکثریت سے نہ جتا دیں کہ مقتدر محبان وطن کی 11 سالہ محنت اکارت ہی چلی جائے اور یہ خدشہ بینظیر اور پیپلز پارٹی کی شکل میں موجود تھا۔ اور اب عقل کے سارے گھوڑے اس طوفان کا راستہ روکنے پر لگ گئے۔ لہٰذا پیپلز پارٹی کے مقابلے میں تمام بھٹو مخالف سیاسی قوتوں کو آئی جے آئی یعنی اسلامی جمہوری اتحاد کے نام پر جمع کیا گیا جس کیلیے سب سے نمایاں خدمات جنرل حمید گل صاحب ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی نے سرانجام دیں، وہ اس کھیل کا کریڈٹ کھل کر خود لیتے ہیں۔ ویسے حقیقت بھی یہی ہے۔ گو ملک کا قاعدہ قانون ان باتوں سے سرکاری ملازمین کو منع کرتا ہے مگر ملکی مفاد میں قانون شکنی میں کیا حرج ہے۔ ہم تو ملکی مفاد میں سب سے بڑے قانون آئین کی پرواہ نہیں کرتے، ایسے ویسے چھوٹے موٹے قوانین کی ہمیں کیا

پرواہ ہے؟ بلکہ ہم تو یہ کام یعنی قانون شکنی کارِثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔اس وقت تک متعدد مارشل لاؤں کی وجہ سے یہ قانون شکن ذہنیت ایک عام بات بن چکی تھی۔ احترامِ قانون جیسے فرسودہ اصول ذرا اور قسم کے معاشروں کیلئے ہیں، ہم تو خاص ہیں۔اپنی مارشل لائی ترکیبیں ہیں۔علامہ اقبالؒ سے اب ہمارا تعلق نہیں۔ وہ ملت رسول ہاشمی ﷺ کی بات کرتا تھا، ہم تو مارشل لائی ملت کی بات کرتے ہیں،لہٰذا مارشل لائی ملت میں یہ سب جائز ہے۔لہٰذا شکر ہے کہ یہ محنت بر آئی،جس کے نتیجہ میں مرکزی سطح پر پیپلز پارٹی کو معمولی سی اکثریت مل گئی اور ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں آئی جے آئی جیت گئی، وزیر اعظم بینظیر بھٹو بن گئی اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف بن گئے۔صدر مملکت کے عہدے کیلئے بیوروکریسی کے دھرم پتا، غلام اسحاق خان ہی کو چن لیا گیا اور جنرل اسلم بیگ ظاہر ہے فوج کے سربراہ رہے۔یوں جمہوریت کی ظاہرداری بھی قائم رہی اور غیر ضروری سیاسی طوفانوں کے راستے بھی محدود کر دیئے گئے تا کہ پی پی جمہوریت کوئی قابلِ قدر تبدیلی نہ لا سکے۔ وہ تبدیلی اچھی ہو یا بری ہو، اس سے بحث نہیں ہے۔ہم تو معاملات کو جوں کا توں رکھنا پسند کرتے ہیں کہ ہمارے اعزازات اور اختیارات اسی سے وابستہ ہیں۔ہمارے لئے ہر تبدیلی تباہی ہے اور اسے ہم ملک دشمنی سمجھتے ہیں۔ چاہے اس میں عوام کے ہزار فائدے کیوں نہ پنہاں ہوں۔

اس طرح جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد بھی ہماری تانا شاہی اور بیوروکریسی کی عظیم حکمت عملی نے اقتدار کی بندر بانٹ پر اپنا ہاتھ مضبوط رکھا۔صرف طریقہ کار بدلا تھا۔اس کارِخیر کو مزید مضبوط اور مستحکم کرنے کیلئے اب وفاق اور اس اس

کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے درمیان نفاق بڑھانے اور قائم رکھنے کو اس حکمت کا مرکزی درجہ دیدیا گیا، جس کی علامت وزیراعظم بینظیر بھٹو اور وزیراعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف کی شخصیتیں بنیں۔ ان دو شخصیات کی چپقلش کے پیچھے یہی تقسیم کرو، حکومت کرو کا عظیم فلسفہ کارفرما تھا، ج س کے ڈائریکٹر قصر صدارت اور GHQ کے سیف ہاؤسز میں بیٹھے تھے۔ جنرل اسلم بیگ اور افواجِ پاکستان کو خوشامد کے طور پر تمغۂ جمہوریت بھی ملا، مگر پنچایت کے سب فیصلوں کے باوجود چوہدری کے کوٹھے کا پرنالہ وہیں رہا جہاں اسے رہنا تھا۔ قلمکار خود اس کھیل کا حصہ رہا ہے جس کا احوال قلمکار کی خودنوشت فردِ جرم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن نوکر ہے تو نا چار کر، کے مصداق کے باوجود مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے اور میں توبہ کا خواستگار ہوں۔ میگر میرے ساتھی خاص طور پر جنرل صاحبان پتہ نہیں، کیوں توبہ کی طرف نہیں آتے بلکہ توبہ کی بجائے وہ اپنے گناہوں پر خوب اتراتے نظر آتے ہیں۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ برائی کی بدترین شکل وہ ہوتی ہے جب لوگ اپنے گناہوں پر شرمسار ہونا چھوڑ دیں اور اپنے گناہوں پر اترانا شروع کردیں۔ ملت رسول ہاشمی ﷺ کو ہم ملت مارشل لاء بھی بناتے ہیں مگر پھر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ قوت واخوت عوام کے نظام کو آمریت کا خول چڑھا کر اور عوام کے حقوق غصب کر کے پھر بھی ہم نہایت منافقت کے ساتھ قومی ترانے پر جھوٹا سا سلام پیش کرتے رہتے ہیں۔ اسلام کو قائداعظمؒ کی طرح اپنے روح وقلب کا حصہ بنانے کی بجائے ہم اسے ایک سیاسی ہتھیار بنا کر خوب استعمال کرتے ہیں مگر مجال ہے کہ ہم اس استعمال پر ذرا بھر شرمندہ ہوں کہ ہم اب تک ملت مارشل لائی اور منافقت کے لات منات عزیٰ

بن چکے ہیں اور ہر لمحہ یہی ہمارا پیرہن و پیغام ہے۔ خدا ہمیں صحیح راستہ دکھائے اور توبہ کی توفیق دے۔

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی سیاسی کشمکش ایک دفعہ اس نقطہ پر آن پہنچی کہ قریب تھا بے نظیر کیخلاف باقاعدہ دستوری طریقے سے عدم اعتماد کی تحریک کامیاب ہوجائے اور آئی جے آئی کی طرف سے غلام مصطفےٰ جتوئی وزیراعظم بن جائیں، مقتدروں نے دیکھا کہ اس صورت میں تو پھر ان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ پھر تو سیاستدان خود حکومتیں بدل لیا کرینگے اور پھر سیاست کا کاروبار چل پڑیگا۔ اصل مقتدر تو پھر عضو معطل بن کر رہ جائیں گے۔ لہٰذا عین آخری وقت میں نواز شریف کو غلام اسحاق خان نے طریقے سے یہ تاثر دیا کہ آسان راستہ تحریک عدم اعتماد نہیں بلکہ آٹھویں ترمیم کے اختیار کا صدارتی استعمال ہے، جو وقت آنے پر ہوجائیگا۔ ادھر جتوئی صاحب کو جنرل اسلم بیگ نے سمجھایا کہ صدارتی اختیار کے استعمال ہی میں ان کیلئے بہتری ہے۔ اسطرح انہیں عبوری وزیراعظم بنادینگے اور پھر الیکشن کے بعد وہ پکے وزیراعظم ہونگے۔ یوں سیاسی کی بجائے ایک انتظامی طریقہ سے بینظیر بھٹو جکو ہٹانے کی افادیت کو نہایت عمدگی کے ساتھ ان سیاستدانوں سے منوالیا تاکہ منتظمین اور مقتدروں کی ضرورت سے یہ نادان بچے بے نیاز نہ ہوجائیں۔ کیوں کیسی حکمت عملی ہے یہ۔ واہ سبحان اللہ! پھر 6 اگست 1990ء کو بینظیر حکومت کو تقریباً وہی الزامات لگا کر فارغ کردیا گیا، جو محمد خان جونیجو پر لگائے گئے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی عبوری وزیراعظم بن گئے اور پھر وہ سیاسی جماعتیں جو آئی جے آئی سے باہر رہ گئی تھیں، انہیں بھی سی او پی یعنی متحدہ اپوزیشن کا نام اور بشکل دیگر برخاست شدہ بینظیر بھٹو

کیخلاف ایک زبردست انتخابی اتحاد میں اکٹھا کرلیا۔ ملاحظہ ہو یہ اتحاد حکمران بناتے ہیں مگر نام رکھتے ہیں متحدہ حزب اختلاف یعنی معنوی طور پر یا مقتدروں کے تصور میں اصل حزب اقتدار ابھی تک پیپلز پارٹی ہی ہے جس کیخلاف ایک وفادار حزب اختلاف درکار ہے، حالانکہ اقتدار پر اس حزب کا اقتدار بذریعہ جرنیلی اختیار (آٹھویں ترمیم) کروا بھی چکے ہیں۔

مگر قدرت کے بھی عجیب رنگ ہیں، 1990ء کے الیکشنوں کے نتائج کچھ ایسے نکلے کہ مقتدروں کی عظیم حکمت عملی دھری کی دھری رہ گئی۔ جس نواز شریف کو وہ بے نظیر کے مقابلہ میں کھلاتے رہے تھے، وہ نواز شریف اب عوام، خاص طور پر پنجاب کے عوام، کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس نے غلطی سے کچھ عوامی نوعیت کے کام بھی کر لیئے تھے۔ کچی آبادیوں کو پختہ کر دیا تھا، تین مرلہ سکیموں سے غریبوں کیلئے مکان بنا دیئے تھے، نشتر سکیم کے تحت غریب مزدوروں کیلئے اچھے اچھے ہسپتال بنا دیئے تھے، اپنی بہتر صلاحیتوں کے ذریعہ امن عامہ کو بہتر کر رہا تھا، لہٰذا ممنون و مشکور عوام نے انہیں پنجاب کی 115 نشستوں میں سے 92 نشستیں طشتری میں سجا کر دیدیں۔ اب مقتدر غلام مصطفیٰ جتوئی کو کیسے وزیر اعظم بنائیں؟ مگر اسکے باوجود آخری لمحہ تک مقتدروں کی یہی کوشش رہی کہ وزیر اعظم جتوئی صاحب ہی بنیں کیونکہ اگر نواز شریف جیسا ہردلعزیز شخص وزیر اعظم بن گیا تو وہ جھران کا محتاج کیوں رہے گا۔ وہ تو سمجھے گا کہ اسے وزیر اعظم عوام نے بنایا ہے اور ایسے شخص کو لازمی طور پر مینڈیٹ کی بیماری لاحق ہو جائے گی۔ جو پاکستان کی اصلی سرکار کی صحت کیلئے کسی صورت بھی موافق نہیں ہوتی۔ مگر اب کوئی چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ لہٰذا انہیں بادل نخواستہ پاپولر نواز شریف کو

وزیراعظم بننے ہی دینا پڑا۔ وگرنہ اسلم بیگ آخری وقت تک یہی کوشش کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح جتوئی صاحب جن کی عوامی بنیاد کمزور تھی، وہ اس عہدہ پر فائز ہوں تا کہ وہ انکا کھیل ایک کٹھ پتلی کی طرح کھیلتے رہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر جنرل حمید گل صاحب نواز شریف کے لئے اصرار نہ کرتے تو اتنی اکثریت کے باوجود وزیراعظم جتوئی صاحب ہی بنتے۔

میاں نواز شریف جنرل اسلم بیگ کے سینے پر مونگ دل کر وزیراعظم بن تو گئے مگر جنرل اسلم بیگ نے انہیں دل سے قبول نہیں کیا اور مناسب موقع کی تلاش میں رہے کہ کس طرح ان پر حملہ آور ہوا جائے اور خلیجی جنگ نے وہ سنہری موقع فراہم کر دیا۔ نواز شریف حکومت کی سعودی عرب، کویت اور امارت کے دوستوں کے حق میں پالیسی کیخلاف ان کا آرمی چیف بالکل کھل کر سامنے آگیا اور عراق کے حق میں بیان دینے لگا، پوری اسلامی دنیا ایک طرف تھی اور عراق دوسری طرف مگر عراق کے خلاف امریکی فوجیں بھی صف آراء تھیں۔ اسلئے جنرل اسلم بیگ نے نواز شریف کی ضد میں اسے عراق امریکہ جنگ کے رنگ میں پیش کر کے اسے اسلام اور کفر کی جنگ کی صورت دیدی۔ حالانکہ حقیقت اسکے بالکل الٹ تھی۔ مگر مکر کا اپنا ہی طلسم ہوتا ہے۔ بے چارے عامتہ الناس نے یہی سمجھا کہ امریکہ کا عفریت اسلامی عراق کو ہڑپ کرنے لگا ہے، لہٰذا جنرل صاحب نے پاکستان کے اندر ایک عوامی بے چینی کی لہر کو ابھارا تا کہ انکی مرضی کیخلاف آمدہ وزیراعظم کی چھتی کا بندوبست ہو سکے۔ اس مقصد کیلئے جنرل صاحب نے امریکی فوجوں کی شکست فاش کی نوید بھی سنا ڈالی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور عراق جنگ کے دوران سر تک نہ اٹھا سکا اور دنوں میں سرنگوں

تھا۔اسطرح جنرل اسلم بیگ کی بات بے وقعت ہوکر رہ گئی اور اس طرح قائداعظم کے پاکستان میں ایک دفعہ پھر مارشل لاء لگتے لگتے رہ گیا۔ ویسے تو 1971ء کے واقعات نے یہ بات بخوبی ثابت کردی تھی کہ ہمارے بہت سے جرنیلوں کو بہت سی باتوں اور بہت سے مسائل کی سوجھ بوجھ تو الاماشاءالہ ضرورت سے زیادہ ہی ہے لیکن جنگ وجدل کے معاملات میں وہ خاصے نالائق ہیں۔ لیکن لوگ وہ بات بھول چکے تھے۔ خلیجی جنگ نے ہمیں ایک دفعہ پھر یاد کروایا کہ چرچل ٹھیک ہی کہہ گیا تھا کہ جنگ ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے،اسے محض جرنیلوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا اور یوں پاکستان ایک برابر فرق کے ساتھ مارشل لاء کی لعنت سے محفوظ رہ گیا۔

میاں نواز شریف اس طرح جنرل اسلم بیگ کی گرفت سے تو بچ گئے مگر آٹھویں دستوری ترمیم کی وجہ سے وہ اپنے پسندیدہ جنرل حمید گل کو اگلا چیف آف آرمی سٹاف نہ بنا سکے اور صدر اسحاق نے ان کے سر پر جنرل آصف نواز جنجوعہ کو لا بٹھایا۔ جنرل حمید گل کو آخر کار نوکری ہی سے ریٹائر ہونا پڑا۔ میاں نواز شریف چونکہ انقلابی آدمی ہیں، اسلئے وہ نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے، انہوں نے بھی عوامی بہبود کے کام شروع کر دیئے۔ کاروباری لوگوں کی بحالی عزت کی راہیں نکالیں۔ بیرون پاکستانیوں کیلئے بھی عزت نفس کے راستے تراشے۔ گرین چینل کو رواج دیا۔ محکمہ انکم ٹیکس وغیرہ کی رشوت کم کرنے کیلئے خود تشخیصی قسم کی سکیموں کا اجراء کیا۔ مواصلات کے سیکٹر میں فوری ٹیلی فون کی سہولت ہی نہیں کمپیوٹر اور ای میل تک کی سہولت شروع کردی۔ موٹرویز اور واٹرویز کا جال بچھانے کا پروگرام بنالیا۔ بلٹ ٹرین کیلئے تیاری شروع کردی۔ پل اور سڑکیں شروع کروادیں اور پتہ نہیں کیا کیا طوفان کھڑے کر دیئے۔ الہٰذا ہماری مستقل

سرکار بیوروکریسی اور تاناشاہی کی عظیم الشان کیفیت استراحت میں خلل اندازی محسوس ہوئی اور وہی نواز شریف جو خود ان ہی کا تراشیدہ بت تھا۔ انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگا کہ یہ کیا ہو گیا ہے ہمارا ہی بنایا ہوا آدمی ہمارے ہی خوابوں کو خراب کر رہا ہے، لہٰذا اسکی چھٹی کروا دینا ہی بہتر ہے۔ جنرل آصف نواز نے سب سے پہلا حملہ مسلم لیگ اور نواز شریف کی حلیف جماعت ایم کیو ایم پر کر دیا اور نواز شریف کچھ بھی نہ کر سکا۔ لہٰذا ایم کیو ایم حکومت سے علیحدہ ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ آصف نواز نے ایک متوازی ایم کیو ایم حقیقی کے نام سے ترتیب دے لی۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو ایم کیو ایم حقیقی بنے۔ ایم کیو ایم کا وہ بدمعاش اور قاتل ٹولہ تھا جو 1992ء کے فوجی آپریشن سے بھاگ کر پنجاب آیا تھا، جسے یہاں کی پولیس نے گرفتار کر لیا مگر آصف نواز نے ذاتی طور پر مداخلت کر کے اور وزیر اعظم پر دباؤ ڈال کر صرف اسلئے چھڑوالیا تھا کہ انہیں اب جنرل صاحب کی مرضی کے مطابق کام کرنا تھا۔ راقم خود اسوقت پنجاب کا آئی جی پولیس تھا اور اندرونِ خانہ ان تمام رازوں سے بخوبی واقف ہے۔ چھوڑنے کے گناہ میں، میں خود شامل ہوں اور آج تک شرمندہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آصف نواز نے ایم کیو ایم کے الطاف حسین پر اپنی مہاجر قومی موومنٹ کا نام متحدہ قومی موومنٹ رکھ کر ایک پاکستانی قوم کا حصہ بننا پسند کر لیا تھا کہ پاکستان کا اصلی قائد محمد علی جناحؒ 11 اگست 1947ء کو یہ بات کہہ گیا تھا۔ مگر تقسیم کرو اور حکومت کرو کے فلسفہ دانوں کو یہ کیسے پسند ہو سکتا تھا۔ وہ مختلف الزامات کے تحت گردن زدنی ٹھہرے اور ان کے اندر موجود بدترین عنصر کو حقیقی کا روپ پہنا کر محبِّ وطن مقتدروں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ ہائے رے حرصِ اقتدار نشاط ہے، کس کس طرح لیاقت علی

خان کو قتل کر دو، مجیب الرحمان کو اقتدار مت دو، بھٹو کو پھانسی لگا دو، نواز شریف کو کھوکھلا کر دو، بدمعاشی کے زور پر متحدہ قوم بننے پر سزاوار ٹھہرا دو۔

جنرل آصف نواز کے اس حملہ سے نواز شریف کی حکومت پھر بھی بچ نکلی۔ اب کیا کیا جائے؟ کیوں نہ ایک دفعہ پھر بینظیر اور نواز شریف کی لڑائی کو مزید بھڑکا دیا جائے کیونکہ چالاک نواز شریف نے بینظیر کے خلاف اسحاق خان کے بنائے کرپشن ریفرنسوں کو سیاسی شائستگی کے تقاضے کے تحت کم رفتار اور ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن اس کا خاوند آصف زرداری ابھی تک پابند سلاسل ہی تھا۔ گو نواز شریف نے اسے نیشنل اسمبلی کے ممبر ہونے کی حیثیت میں کافی سہولتیں دے رکھی تھیں، جس کیلئے وہ غلام اسحاق خان کے طعنے بھی سہتا رہا تھا کہ وہ اسطرح ان میاں بیوی جوڑے کا منی مون منیجر کا کام کر رہا ہے، مگر پھر بھی بینظیر کے دل میں نواز شریف کے خلاف تلخی موجود تھی۔ جنرل آصف نواز نے اس تلخی کا فائدہ اٹھا کر جس وقت ملیحہ لودھی صاحبہ کے ذریعے بے نظیر کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ نواز شریف کیخلاف لانگ مارچ کرے تو وہ آصف نواز کو اپنا ہمدرد پائے گی۔ بینظیر نے بھی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسی وقت لبیک کہہ کر 18 نومبر کی تاریخ دیدی اور لانگ مارچ داغ دی مگر وہ لانگ مارچ کوئی زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئی اور جنرل صاحب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ نواز شریف نے زرداری کی ضمانت کا اہتمام کروا دیا اور ساتھ ہی محترمہ بینظیر بھٹو قائد حزبِ اختلاف کو پارلیمنٹ کی خارجہ کمیٹی کا سربراہ بھی بنا دیا۔ نواز شریف نے یہ سب کچھ اپنی سیاسی شائستگی کی وجہ سے کیا مگر ہماری مستقل سرکار کو یہ کیسے ہضم ہو سکتا تھا کہ سیاسی عمل کے تقاضوں کے تحت یہ لوگ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں، اسطرح تو بعض کلیدی

قومی امور پر پھر قوم اکٹھی ہو جائے گی۔ اسی طرح جیسے جنرل ضیاء الحق کا لگایا ہوا نفاق پوادا ایم کیو ایم مہاجر سے متحدہ بن رہا تھا۔ اب اگر حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف اسطرح شائستگی کے پل پر چل نکلیں تو مقتدروں کے کھیل کا کیا بنے گا۔ لہٰذا تانا شاہی اور بیوروکریسی کے کیمپ میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ جنرل آصف نواز تو ہو کے سے ہی مر گئے مگر غلام اسحاق خان، ان سب کے گرو تو موجود ہی تھے اور جنرل آصف نواز کی جگہ آنے والے جنرل وحید کاکڑ ویسے ہی خان صاحب کے برخوردار تھے۔ لہٰذا فیصلہ ہو گیا کہ نواز شریف کو چونکہ عوامی مینڈیٹ کی بدہضمی ہو گئی ہے اور وہ ہمارے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے، اسلئے اسے نکال باہر کیا جائے۔ اسلئے ضروری تھا کہ محترمہ کو اپنے ساتھ ملایا جائے۔ لہٰذا نوابزادہ نصر اللہ خان اور جتوئی صاحب کے ذریعہ یہ کام کر لیا گیا۔ اب بینظیر اور اسحاق خان ایک پلیٹ فارم پر تھے اور نواز شریف دوسرے پلیٹ فارم پر۔ حامد ناصر اور اسحاق خان ایک پلیٹ فارم پر تھے اور نواز شریف دوسرے پلیٹ فارم پر۔ حامد ناصر اور منظور وٹو کے ذریعہ مسلم لیگ کے اندر نقب لگائی گئی اور عوام کے مینڈیٹ سے آئے ہوئے اور عوامی فلاح و بہبود کے کام کرنے کے گناہ میں آلودہ نواز شریف کو دستور کی آٹھویں ترمیم کے اختیارات کے سہارے ڈسمس کر دیا گیا اور ان پر بھی وہی الزامات تھوپے گئے جو کبھی جنرل ایوب خان نے بانیانِ پاکستان پر تھوپے تھے۔ ضیاء الحق نے جونیجو اور غلام اسحاق نے اس سے قبل خود بے نظیر بھٹو پر لگائے تھے، اسکے ساتھ ہی بے ایمان راندۂ درگاہ آصف علی زرداری ایک دفعہ پھر غلام اسحاق خان کے تحت کابینہ میں وزیر تھا۔ کل کا قیدی آج کا وزیر تھا اور وہی الزام کنندہ غلام اسحاق خان اس کھیل کا ڈائریکٹر ایکٹر تھا۔ واہ ری بے چاری جکڑی

ہوئی جمہوریت کہ تو اب طوائف ہے، گھومے جا ہو سبو کی کیساتھ۔ تو اب قائد والی جمہوریت نہیں بلکہ فوائد والی جمہوریت ہے۔اب تیرے ساتھ یہی کچھ ہوگا۔

میاں نواز شریف اور انکی حکومت کیخلاف یہ الزامات اتنے بے بنیاد اور بوگس تھے کہ رٹ درخواست پر پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ نے جسٹس منیر کی روایت کے برعکس فیصلہ کے حق میں کردیا۔اسمبلیاں اور نواز شریف حکومت بحال کردی مگر تانہا شاہی اور بیوروکریسی کو اس قانونی نفاست سے کیا تعلق۔ان کا تو کاروبار گلشن ہی اجڑ گیا تھا، لہٰذا وہ اپنے نئے جال لیکر آگئے۔منظور وٹو اور حامد ناصر چٹھہ کے سہارے میاں نواز شریف کے سیاسی گڑھ صوبہ پنجاب کو انکے خلاف کھڑا کردیا۔جس سے تنگ آکر میاں نواز شریف نے خود مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا اور نئے انتخابات کی راہ اپنائی تاکہ مادرِ وطن کے اندر غیر ضروری خلفشار نہ بڑھے۔اسوقت انہیں یقین تھا کہ عوام انہیں دوبارہ منتخب کرکے اسمبلی میں بھجوادیں گے مگر جنہوں نے اتنے پاپڑ بیل کر نکلوایا تھا، وہ یہ کیسے برداشت کرسکتے تھے۔انہوں نے ان کی حلیف ایم کیوایم کو الیکشن میں حصہ ہی نہ لینے دیا اور دینی سیاسی جماعتوں کو اکٹھا کرکے ایک تیسری قوت کی شکل دیدی کہ کم از کم وہ پاکستان مسلم لیگ اور نواز شریف کے ووٹ تو توڑیں گے اور وہ انہوں نے توڑے لیکن اسکے باوجود جب نتیجہ پھر بھی مسلم لیگ اور نواز شریف کے حق میں جاتا دیکھا تو GHQ نے مداخلت کرکے رات کے گیارہ بجے کے بعد دو گھنٹے تک نتائج رکوادیئے اور پھر ایک ایسا نتیجہ نکلا جس کی رو سے مسلم لیگ تھوڑی سی نشستوں سے حکومت سازی کی اہلیت سے محروم رہ گئی۔مزے کی بات ہے کہ صوبہ پنجاب کی حد تک مسلم لیگ حکومت سازی کی پوزیشن میں آرہی تھی مگر وہاں بھی راتوں رات ایسا

کرتب دکھایا کہ اقلیتوں کے تمام ممبران اور وٹو گروپ اکٹھے ہو کر پیپلز پارٹی سے جاملے اور منظور وٹو کو وزیر اعلیٰ بنانے کا فیصلہ ہو گیا تاکہ اس دفعہ نواز شریف کو مکمل طور پر حزب اختلاف کا مزا چکھایا جائے۔ دراصل یہ ایک تعزیری حربہ تھا کیونکہ تاناشاہی کے خیال میں نواز شریف نے بے وفائی کا گناہ عظیم کیا تھا، وہ اب سزا کا مستحق تھا جیسا کہ شریر بچوں یا ناخلف اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مگر اب میاں نواز شریف کو اچھی طرح سے سزا دینا اتنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ عوام نے تو انہیں جتا ہی دیا تھا۔ لہٰذا اب انہیں اقتدار سے باہر رکھنے کیلئے بہت زیادہ جتن کرنے پڑے تھے۔ اسلئے ضروری تھا کہ بینظیر بھٹو کو اس تعزیری رول کیلئے ہر طرح کی سپورٹ دی جائے۔ صدر بھی اس کی مرضی کا ہو اور چیف جسٹس بھی ایسا ہو جس نے سندھی کے ناطے اور وجہ کے نواز شریف کی حکومت کی بحالی کی مخالفت کی تھی۔ یوں فاروق لغاری اور اور سید سجاد علی شاہ کی سازشی جوڑی بھی سامنے لائی گئی۔ اس مختصر مضمون میں ان تمام واقعات کو لکھنے کی گنجائش نہیں ہے جو آئندہ تین سال میں نواز شریف کی سزایابی کیلئے رونما ہوئے۔ انکے والد سے لیکر نابالغ بھتیجے حمزہ شہباز کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ وہ سب لوگ جانتے ہیں، ان کے گھر کے جنگلے تک گرا دیئے گئے، وہ بھی لوگ جانتے ہیں۔ شہباز شریف کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا، وہ بھی سب جانتے ہیں مگر ایک واقعہ کوئی نہیں جانتا اور وہ میں سناتا ہوں۔ جب بینظیر نے نواز شریف اور اسکے خاندان کو بہت زیادہ تنگ کیا اور قریب تھا کہ یہ لوگ دباؤ میں آ کر ڈھیر ہو جائیں تو جنرل وحید کاکڑ نے میاں شہباز شریف کو کہلوا بھیجا کہ وہ ملک میں مارشل لاء لگانے کیلئے تیار ہیں، بشرطیکہ پاکستان مسلم لیگ اس معاملہ میں ان کا کھل کر ساتھ دے۔ میاں

شہباز شریف نے کسی سے مشورہ کیے بغیر بلا تامل اسی وقت کہا کہ نہیں ہم ملک میں مارشل لاء نہیں چاہتے، اس سے ملک کو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے، ہم اپنی تکالیف اپنی جگہ برداشت کرلیں گے، مر جائیں گے، مالی طور پر تباہ ہو جائیں گے مگر ملک میں مارشل لاء کو ویلکم نہیں کرینگے۔ دیکھا سیاسی عمل کی خوبصورتی! یہ بات کون کہہ رہا ہے۔ میاں شہباز شریف! جو خود ایک طرح سے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی پیدائش ہیں۔ ادھر مقتدروں کا طریقہ واردات دیکھا جائے کہ قائد کے بتائے وحدت ملی کے طریقہ کے بالکل تقسیم کرو، حکومت کرو کے فلسفہ کی بنیاد پر طرح طرح سے قومی تقسیم اور انتشار کا اہتمام کارِ ثواب کے طور پر کیا جائے۔ ایک کو کہا سزا دو اور دوسرے کو کہا ہمارا ساتھ دو۔ اسے کہتے ہیں کہ بلیوں کی لڑائی میں بندر بانٹ کرے۔

یہاں یہ فطری سوال اٹھتا ہے کہ پھر یہ سیاستدان اتنے احمق کیوں ہیں کہ ان مقتدروں کے بہکاوے میں اتنی آسانی سے آجاتے ہیں۔ چلیے میاں شہباز شریف اس جال میں نہ پھنسے مگر اکثریت کی کہانی تو ذرا دوسری ہی ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اتنے ہی بیوقوف ہیں تو پھر ٹھیک ہے ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے مگر ساتھ قوم بھی تو اسکی سزا بھگتتی ہے۔ اس بات کو اتنی سادگی سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے مضمرات بہت زیادہ ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ سیاستدان نظریاتی سے کہیں زیادہ مفاداتی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا حرص و ہوس کا شکار ہو کر حالات کے اندر دھنستے اور پھنستے چلے جاتے ہیں۔ ہر کوئی قائداعظم تھوڑا ہی ہے، یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے مگر ایک اور بنیادی وجہ بھی ہے کہ سیاست میں اختلافِ رائے کا ہونا ایک صحت مند ہی نہیں بلکہ اساسی جزو ہے۔ اگر اختلافِ رائے نہیں ہوگا تو پھر وہ

سیاست سے کہیں زیادہ ایک رجمنٹ نظر آئیگی اور وہ سیاسی رجمنٹ پھر فاشزم کہلواتی ہے اور فاشزم کے اپنے نقصانات ہوتے ہیں۔ بھٹو اور مجیب الرحمان کا فاشزم آپ نے دیکھا ہی ہوا ہے، جب ان کے سامنے سب مقتدر ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ عوامی طاقت نے فوجی طاقت کو چت کر کے رکھ دیا مگر نقصان بھی تو ہوا۔ لہٰذا قائداعظمؒ کے پاکستان میں فاشزم کی ضرورت ہے اور نہ ہی مارشل لاء یا فوجی رجمینٹیشن کی۔ پاکستان کیلئے یہ دونوں ہی نظریئے اجنبی اور جان لیوا ہیں۔ پاکستان کو تو صرف اور صرف نظریہ پاکستان کی ضرورت ہے جس کے محور اور اساس اسلام اور جمہوریت ہیں۔ یہ بات عقل کی نہیں عقیدے کی ہے۔ عقل تو ابلیس کی بھی بہت زیادہ تھی اور ہے کہ ہر جگہ اللہ سے بحث ہی کرتا نظر آتا ہے مگر عقیدہ نہیں ہے تو پھر راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسطرح کے سوالات اگرچہ بہت زیادہ منطقی نظر آتے ہیں مگر یہ متعلقہ نہیں ہیں۔ سیاست کی رنگینی اور افادیت اختلافِ رائے کے احترام ہی سے منسلک ہے اور ہر ایک کو اسکا احترام کرنا چاہئے۔ سیاستدانوں کو بھی اور مقتدروں کو بھی۔ خاص طور پر مقتدروں کو کہ وہ بدعقیدگی سے کام نہ لیں۔ جو کچھ پہلے سات برس کے بعد پاکستان میں ہوتا رہا ہے، وہ جنرل ایوب خان اور اس کے جانشینوں کی بدعقیدگی کا مظہر ہے۔ بدعقیدگی کو برائی کہتے ہیں، بے عقلی نہیں اور برائی پر اترانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی جنرل انگلستان ،امریکہ یا بھارت میں بدعقیدہ ہو جائے تو کونسا مائی کا لال ہے جو حکومت پر قبضہ کر لینے سے روک لے گا۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں کی رائے عامہ اسے زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دے گی۔ کیا ملک پاکستان میں ایسا بار بار نہیں ہوا۔ یہاں کے عوام نے کبھی بھی مارشل لاء کو دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ جنرل ایوب خان، جنرل یحیٰی خان

اور ضیاء الحق کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا اور ہو رہا ہے۔ عوام میں بدعقیدگی قطعاً نہیں ہے۔ بدعقیدگی مقتدروں کے ہاں ہے، جو مولوی کی تاویل کی طرح اکثر حرام کو حلال قرار دے لیتے ہیں۔ اسلئے ضرورت ہے کہ مقتدر طبقے اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے بدعقیدگی سے توبہ کر کے قائداعظم کیبتائے ہوئے راہ راست کی طرف مراجعت کریں اور پاکستان کے عوام کو ان کا بنیادی اثاثہ نظریہ پاکستان لوٹا دیں جس کی بنیاد اسلام اور جمہور ہے۔ غیر ضروری دلیل کشی سے باز رہیں اور عقیدے کو عقل کے پیمانوں سے نہ ماپیں کہ عقل محوِ تماشا رہتی ہے، کام عشق ہی دکھاتا ہے۔ اسی کی دہائی میں امریکہ افغانستان کے حوالے سے روس کو مزہ چکھانا چاہتا ہے اور پاکستان کو ایف 16 لڑاکا طیارے مفت دینے کو تیار ہے مگر یہاں کی ائرفورس کے ایک عقلمند سربراہ کہتے ہیں کہ ہم مفت نہیں لینگے کیونکہ یہ ہماری ملی عزت نفس کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ جنرل ضیاء الحق بھی اسی لائن پر چڑھ جاتے ہیں۔ آغا شاہی جیسا دانا بندہ بار بار یہی بیان داغ دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھولے ہوئے ہیں کہ کہ ہم تو 1954ء سے امریکی امداد کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اس وقت بھی مدد ہی سے کام ہو رہے تھے اور امریکی امداد کیلئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔ اگر یہ بات اس عقیدے کے ساتھ کی جاتی کہ اسوقت کے بعد ہم امریکی امداد کیلئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔ اگر یہ بات اس عقیدے کے ساتھ کی جاتی کہ اس وقت کے بعد ہم امریکی امداد سے توبہ کر لینگے تو واقعی یہ ایک زبردست بات تھی مگر یہ بات عشق و عقیدہ کے ساتھ نہیں کی جا رہی تھی۔ یہ بات عقل کے دریچوں سے آ رہی تھی اور وہ عقل کے دریچے تھے، اس سودے کے بھاری کمیشن۔ جس کی ایئر چیف کو زبردست خواہش تھی۔ اب بتائیے کہ ہمیں عقل

درکار ہے یا عقیدہ۔ مقتدر واقعی بڑے ہی عقل مند ہیں مگر افسوس ہے کہ وہ عقیدہ سے تہی دامن ہیں۔ ہماری پچاس سالہ تاریخ ایسے ہی عقلمندوں سے بھری پڑی ہے جو ہر بہانے قوم کو آپس میں تقسیم تو کر سکتی ہے مگر عشق سے لبریز قائد کی راہ پر اسے اکٹھا کر ہی نہیں سکتی بلکہ اکٹھا ہونے نہیں دیتی اور اسکا نام ان بدبختوں نے گرینڈ حکمت عملی رکھا ہوا ہے۔ اب اس عقل کو ہم کیا کریں جو ہماری تباہی کا باعث بن جائے۔ ہماری جان ہی نکال دے اور ہمیں دولخت یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے۔ واہ رے بی بی عقل تیری کون سے کل سیدھی ہے۔ میں عقل سے باز آیا، میں سودائی ہی بہتر ہوں، یا اللہ مجھے سودائی بنادے، عظیم قائد کے اصولوں کا سودائی۔

بہرصورت چونکہ بے وفا شریر بچے کو خوب سزا دینا مقصود تھا، اسلئے تانا شاہی کی طرف سے مامود تعزیری ٹولہ جو کچھ بھی کرتا رہا، وہ جائز ٹھہرا۔ چاہے وہ بینظیر و بے مثل رشوت خوری تھی یا بدترین بدنظمی و بددیانتی تھی۔ حتیٰ کہ اس ٹولے کے اندر کے تضاد کی دراڑیں اسطرح ابھر کر سامنے نہیں آگئیں۔ جس طرح چوروں، ڈاکوؤں کے درمیان مسروقہ مال کی تقسیم پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہو کہ ان کی اپنی ہی بربادی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ سید سجاد علی شاہ اور فاروق لغاری کی اپنی علیحدہ علیحدہ شکایات تھیں اور جس بات کی بناء پر بے نظیر سے ناراض ہو گئے اور پھر اسکی رخصتی کا رخت سفر بندھا اور وہ اپنے ہی بنائے ہوئے صدر کے ہاتھوں ذلت اٹھا کر رخصت ہوئی حالانکہ وہ اقتدار کی کالی دیوی کیلئے اپنے سگے بھائی مرتضیٰ بھٹو کا خون تک پیش کر چکی تھی۔ اسے کہتے ہیں شامتِ اعمال۔

اس شامتِ اعمال کے بعد ایک دفعہ پھر ملک کے اصل مالکان یعنی عوام سے

رجوع کیا گیا۔ اور انہوں نے پاکستان مسلم لیگ اور میاں نواز شریف کو ملک کی تاریخ کا سب سے زیادہ بھرپور مینڈیٹ دیا۔ جس کی بناء پر دستور کی وہ تمام کجیاں اور خرابیاں دور کی جا سکتی تھیں، جن کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخابات کی لائی ہوئی لعنت ہارس ٹریڈنگ اور آٹھویں دستوری ترمیم سے متعارف شدہ سیاسی استحکام کا کھیل ختم ہو سکتا تھا اور جسے قوم ختم کرنا چاہتی تھی۔۔ لہٰذا اس دور میں جسے عوام کے اس زبردست فیصلہ کی وجہ سے مقتدروں کے ہاتھ باندھ دینے کا دور کہا جا سکتا ہے ۔ دستور کے اندر فوری طور پر دو متفقہ ترامیم ہوئیں، جو تیرہویں اور چودھویں ترامیم کے نام سے موسوم ہوئیں۔ تیرہویں ترمیم نے جمہوریت کی اس ہیئت کذائی کی تصحیح کر دی جو جنرل ضیاء الحق نے اسے یرغمالی بنائے رکھنے کیلئے صدر یعنی اپنی ذات میں پارلیمینٹ کے اختیارات مرتکز کر لئے تھے تاکہ حسب ضرورت سیاسی عدم استحکام کا کھیل جاری رکھا جا سکے۔ دوسری ترمیم کے ذریعے ممبران کی نفسانفسی، ذاتی مفادات کی کشش اور ہارس ٹریڈنگ کی جگہ پارٹی ڈسپلن اور اجتماعی مفاد کی برداخت و ترویج کی راہیں نکالی جا سکیں۔ یہ دونوں ترامیم پوری قوم کا مطالبہ تھیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت نیشنل اسمبلی یا سینیٹ میں کسی جماعت کی طرف سے نہیں ہوئی۔ ان ترامیم کے حق میں مسلم لیگ تھی تو پیپلز پارٹی بھی تھی، ایم کیو ایم تھی تو اے این پی بھی تھی، جمعیت اہلحدیث تھی تو جمعیت العلمائے پاکستان بھی تھی، بلوچستان سے بی این پی تو تھی تو پارلیمنٹ کے تمام آزاد ممبران بھی تھے۔ آپ اسے آوازِ خلق کہہ سکتے ہیں مگر اسکو کیا کہیئے کہ اسکی بھرپور مخالفت کی آواز کہیں سے ابھری تو وہیں سے ابھری جہاں سے ابھرنا تھا اور وہ آواز آئی مقتدروں کی طرف سے جن کا ان باتوں سے اصولاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

جنہیں دستور نے یہ ذمہ داری سونپی ہے، وہ سب اپنی اپنی سیاسی مخالفتوں کے باوجود اس تصحیح پر متفق ہیں مگر جن کا ان معاملات سے بالکل تعلق ہی نہیں ہے، ان کے پیٹ میں شدید درد اٹھ رہا ہے۔ ان کی طرف سے عجیب و غریب تاویلیں آ رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اب مارشل لاء کو کوئی نہیں روک سکتا، جیسا کہ مارشل لاء کوئی بہت ہی ناگزیر شے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ کام نواز شریف نے صدر اور پارلیمنٹ کو بالکل آختہ کرنے اور اپنی ذات میں تمام اختیارات مجتمع کرنے کیلئے کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نواز شریف نے اداروں کی مکمل تباہی کیلئے یہ سب اقدامات اٹھائے ہیں۔ اخباروں میں غیر متعلقہ لوگوں کے بیانات آ رہے ہیں۔ دانشور حضرات جن کی ذہنیت پچھلے 45 سالہ آمرانہ مزاج کی وجہ سے خود آمریت پسند ہو چکی ہے، کالم پہ کالم لکھ رہے ہیں اور اک حشر بپا ہے کہ شاید اس وجہ سے کوئی قیامت آ گئی ہے۔ بات تو بہت سادہ سی تھی۔ نواز شریف نے اکیلے نہیں پوری پارلیمنٹ نے بغیر کسی اختلافی آواز کے ایک تصحیح کی جس کیلئے پوری قوم بہت عرصہ سے منتظر تھی مگر جن کے غیر اخلاقی، غیر جمہوری اور بدعقیدہ مفادات کو ٹھیس لگ رہی تھی، وہ شور مچا رہے تھے کہ اب ہم کیا کریں گے اور اپنی بدعقیدگی کیلئے جواز ڈھونڈ رہے تھے۔

سازش کو نشاط ہے کس کس رنگ .... لہٰذا صدر ہاؤس ایک دفعہ پھر سازشی گڑھ تھا اور مزے کی بات ہے کہ اس دفعہ اس گندے کھیل کیلئے ملک کے معزز ترین ادارے کو بھی گھسیٹنے کی کوشش ہوئی اور جو کام دستور نے پارلیمنٹ کے ذمہ واضح طور پر لگا رکھا ہے اور انہوں نے مفاد پرست ٹولہ کیخلاف کر دیا تھا، کو مفلوج کرنے کیلئے ایک انا پرست جج سید سجاد علی شاہ کو استعمال کیا جا رہا تھا تا کہ آوازِ خلق کی نفی کی جا سکے، وہ آوازِ

خلق جس کی بالادستی ہمارے عظیم قائد کا عقیدہ تھا مگر بدعقیدہ لوگوں کو اس سے کیا غرض۔ مگر شکر ہے کہ اس ادارے کے تجربہ کار، پختہ کار اور ذہین جج صاحبان کی اکثریت نے اس غلیظ کھیل کے مضمرات کو بروقت سمجھ لیا اور خود اپنے ہی رفیق کار کی چھٹی کر دی، وگرنہ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ شکر ہے کہ عدالتِ عظمٰی نے بروقت ملک کو تباہی سے بچالیا اور پارلیمنٹ نے سازشی صدر کی چھٹی کرادی وگرنہ کھیل ہی کھیل میں یرغمالی جمہوریت، جو اب واگزار ہونا چاہتی تھی، آزادی کی متلاشی تھی، کا گلا دبایا جانے والا تھا۔

اس فاش سازش کی ناکامی کے بعد اس سیاسی حکومت نے جو بھی اچھے برے کام کرنے تھے، وہ کرتی رہی، شاہراہیں بناتی رہی، مواصلات میں انقلابات لاتی رہی، ہاریوں کو زمین دیتی رہی، مردم شماری جیسا مشکل کام بھی کرلیا، کمپیوٹر اور ای میل وغیرہ کی جدیدیت کے مشاغل کرتی رہی۔ بوٹی مافیا کو ختم کرتی رہی، امن عامہ کی بہتری خاص طور پر ملکی فساد کو فرو کرنے کیلئے مخصوص عدالتیں بناتی رہی، نجکاری بھی کرتی رہی، بین الاقوامی ادھار بھی واپس کرتی رہی، ٹیکس پہ ٹیکس لگاتی رہی، بجلی کے بکھیڑے سدھارتی رہی، کرکٹ بھی کھیلتی رہی اور پتہ نہیں کیا کیا کرتی رہی ......
کام کرتی رہی اور غلطیاں بھی کرتی رہی۔ مگر بدبختوں نے بھارت کے مقابلے میں ایٹم بم کا دھماکہ کرنے کی غلطی بھی کرلی تھی اور وہ غلطی بہت ہی فاش غلطی تھی۔ اس کے بعد نواز شریف اس مقام پہ آن کھڑا ہوا تھا جہاں ایک دفعہ 1954ء میں خواجہ ناظم الدین کھڑا تھا۔ قاری سے میری درخواست ہے کہ وہ ذہن پر زور دے کہ میں نے قائداعظم کے عظیم خواب کے بے تعبیر ہونے کی کتھا اسی خواجہ ناظم الدین سے شروع کی تھی۔ جب اسے امریکی خواہش کیخلاف بغداد پیکٹ میں داخل ہونے پر عذر تھا۔ پھر جنرل

ایوب خان اور ملک غلام محمد نیمل کر اس خواجہ ناظم الدین کی کیا درگت بنائی۔ آپ سن چکے ہیں اور اسکے نتائج بھی بھگت چکے ہیں بلکہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ یہ نواز شریف کس کھیت کی مولی تھا جو صدر کلنٹن اور ٹونی بلیئر کے ٹیلی فون تک کی پرواہ نہیں کر رہا تھا۔ اسے خواجہ ناظم الدین بننا ہی تھا۔ اسے خواجہ ناظم الدین بنایا ہی جانا تھا۔ وقت کی لوح پر یہ بات اسی دن لکھی جا چکی تھی جس دن 28 مئی 1998ء کی شام کو چاغی کی پہاڑیوں میں ایٹم بم کے پانچ دھماکے ہوئے تھے۔ جس دن پاکستان ہی نہیں، پوری امت مسلمہ کا سر فخر سے اونچا ہوا تھا۔ جس دن کراچی کے مقام استراحت سے اس عظیم قائد نے اپنے عظیم اسلامی تجربے کی عظیم بارآوری کو دیکھ کر 1946ء میں قاہرہ میں کہی بات کہ پاکستان تمام اسلامی دنیا کا محافظ ہوگا، کو یاد فرمایا ہوگا۔ اس لمحہ کے بعد نواز شریف خواجہ ناظم الدین نہ بنے، یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ قوم قیادت کے بغیر کمزور پڑ جاتی ہے اور اب اس قائد کی قوم کو کمزور کرنا ضروری ہوگیا تھا اور اس کا بہترین نسخہ قوم اور قیادت کے درمیان فاصلے کھڑے کرنا ہوتا ہے۔ اس کمزوری کے کھیل میں قوم ہی قصوروار نہیں، قیادت بھی برابر کی قصوروار ہے۔ قیادت صاحب نگاہ ہونی چاہئے جو اپنے اردگرد کے معاملات کو بہت زیادہ گہری نگاہ سے دیکھ سکے۔ اگر نہیں دیکھ سکے گی تو پھر خود مار کھائے گی اور قوم کو بھی خوار کرے گی۔ آپ کو لارڈ مونٹ بیٹن کے وہ الفاظ یاد ہیں کہ جب اسے معلوم ہوا کہ محمد علی جناحؒ تپ دق جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہے تو یکدم بلاتاخیر کہہ اٹھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جناح اتنی جلدی مرنے والا ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ آگے لے جاتا تاکہ وہ تقسیم ہند کے گناہ سے بچ جاتا کیونکہ قائداعظمؒ محمد علی جناح کی قیادت کے بغیر نہ یہ قوم بن سکتی

تھیاورنہ ہی مملکت پاکستان بن سکتی تھی۔ دیکھا قوموں کیلئے اعلیٰ قیادت کتنی قیمتی ہوتی ہے۔ اسلئے قیادت کو ختم کرنا اصل میں قوم کو ختم کرنیکا تیر بہدف نسخہ ہوتا ہے۔

ایٹمی دھماکے کے بعد معاشی ناطقہ بندی آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرف دباؤ بڑھا۔ محتاجی کی میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ یہاں میں صرف قوم کے اندر سے بے وقت کی راگنی اور نفاق افزا آوازوں بلکہ چیخوں کی ٹائمنگ کی بات کرتا ہوں کہ پھر ہمیں یکدم نیشنل سیکورٹی کونسل یاد آگئی کہ اس بی بی کے بغیر گذارہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ نسخہ کیمیا 1971ء میں بھی موجود تھا۔ اس وقت پارلیمنٹ موجود نہیں تھی، جس کی وجہ سے پاکستان ٹوٹ گیا تھا۔ اب 1988ء میں یکدم جنرل جہانگیر کرامت کو یاد آیا کہ یہ پارلیمنٹ ایسی فضول سی پنچایت سے بالاتر کوئی پالیسی ساز غیر منتخب ادارہ تو ہو جو پارلیمنٹ کو نکیل ڈال سکے۔ جس کی افلاطونی خرد کے سامنے یہ جاہل کابینہ، پارلیمنٹ اورعوامی شورشرابہ جواب دہ تو ہو۔ یہ معاشی اصولوں سے جاہل بھیڑ کس کام کی۔ اسے ان غیر منتخب سقراطوں کی راہ نمائی درکار ہے۔ اس جہانگیری اور کراماتی تجویز کے پیچھے جب خاص تائیدی سیاسی آوازیں اٹھی تو ظاہر ہے کہ پیغام واضح تھا۔ ہماری قیادت اسے پوری طرح نہ سمجھی اور محض جہانگیر کرامت کی رخصتی کو عظیم کرامات سمجھ لیا۔ وہ تو خطرے یا کسی عظیم حکمت عملی کی صرف ایک علامت تھی۔ ضرورت غصے کی نہیں تھی، ضرورت غور وخوض کی تھی کہ اس وقت یہ آواز کس لئے اٹھ رہی ہے۔

اس کے بعد کارگل کی مہم جوئی، اعلانِ واشنگٹن اور یکدم گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس کی نمو، یہ سب ایٹمی دھماکہ کرنیوالی قیادت کو خواجہ ناظم الدین بنانے کے سلسلہ

کی کڑیاں ہیں۔ایک طرف قیادت کی تباہی درکار ہے تو دوسری طرف پاکستان کی بری افواج کو اندرون ملک کے جھمیلوں میں پھنسا کر ان کی پیشہ ورانہ استعداد کار کو کمزور کرنا مقصود ہے تا کہ عوام اور افواج ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو کمزور اور برباد کر لیں، تا کہ سرحدوں کے محافظ سرحدوں کے پار نہ دیکھ سکیں اور ایک ایٹمی اسلامی قوت اپنے ہی عمل یا بدعملی سے ڈھیر ہو جائے۔کیا یہ عظیم حکمت عملی ہے جو سات سمندر پار سے آئی ہے ۔ اب صرف کوئی بہانہ درکار تھا جیسا کہ سمگلنگ کو 1954ء گھڑ لیا گیا تھا۔یوں ملک کی سلامتی داؤ پر ہے۔لہٰذا خواجہ ناظم الدین کی چھٹی لازم ہے۔یہاں یہ بہانہ 12 اکتوبر 1999ء کو چیف آف آرمی سٹاف کی بے وقت اور بھدے آواز کی ریٹائرمنٹ سے مل گیا کہ اس طرح ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور پھر قیادت بھی پھنس گئی اور فوج بھی دلدل میں پھنس چکی ہے۔کسی شاطر نے کیا کھیل کھیلا ہے۔اب جوہری پاکستان دوراہے پر ہے۔ٹرائل صرف نواز شریف کا نہیں ہو رہا، عدلیہ اور افواج کا بھی ہو رہا ہے کہ سب ادارے اب آزمائش سے دوچار ہیں۔جو لوگ آج بغلیں بجا رہے ہیں، وہ کل پچھتا رہے ہوں گے۔

جو آج زَد پہ ہیں تُو خوش گماں نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہَوا کسی کی نہیں

کیا ہم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے ایک دفعہ پھر 1954ء پر واپس نہیں آ گئے، جب ہم قائد کی بتائی راہوں سے بھٹکے تھے اور ایوب خان کے تار عنکبوت میں پھنس گئے تھے اور پھر اس جال میں دھنستے ہی چلے گئے کہ عزت بھی کھوئی اور آزادی بھی گنوائی۔ملک بھی تڑوا لیا اور کنگال بھی ہو گئے کہ ہم نے قائد کے بتائے

عقیدے قوت واخوت عوام کے نظام سے منہ پھیر کر بدعقیدگی کی پوجا شروع کر دی تھی اوراب تک کرتے جا رہے ہیں۔ بدراہی پر چلے جا رہے ہیں۔

اختتامیہ

بات ذرا لمبی ہوگئی کہ ایک آدھی صدی کا قصہ ہے۔ سوال اٹھا تھا کہ اگر قائد اعظم کا عظیم وژن پہلے سات سال کے بعد ایک جرنیل (ایوب خان) اور ماہر معاشیات (غلام محمد) کی حرص اور کوتاہ اندیشی سے برباد ہونا شروع ہوگیا تھا اور پھر ان کے جانشینوں چاہے وہ فوجی تھے یا سویلین، کے ہاتھوں مزید بربادیوں کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ ہم غیروں کے محتاج بن گئے۔ پاکستان دولخت بھی کر بیٹھے تو کیا پھر وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ محمد علی جناح غلطی پر تھا، وہ درست ہیں یا پھر وہ لوگ جو پاکستان کو ایک ناکام ریاست کا نام دیتے ہیں، کیا وہ درست کہتے ہیں۔

نہیں یہ بات بالکل درست نہیں ہے، ہماری تاناشاہی، بیوروکریسی اور پھر

ان کی پیدا کردہ بونی سیاسی نسلوں کی کوتاہیاں بے شک بے انتہا ہیں۔ان کے پاکستان کے خلاف گناہ بے شمار ہیں۔ وہ بدعقیدہ، بدکار، بدعنوان اور بدعمل ہیں۔انہوں نے پاکستان کے اساسی نظریہ اسلام اور جمہوریت سے بار بار انحراف کیا ہے اور آمریت کے حرام خنزیر کو حلال قرار دیا ہے اور کھایا ہے۔مگر اس سب کے باوجود پاکستان کے اصلی بچوں اور اولاد نے قائداعظمؒ کے دیئے ہوئے نظریئے سے کبھی منہ نہیں موڑا ہے۔انہوں نے اسلامی، جمہوری اور فلاحی پاکستان کے اصلی تصور کی خاطر بار بار قربانیاں دی ہیں۔انہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے بار بار پیش کیے ہیں۔انہوں نے قائداعظم کے لائے ہوئے انقلاب کی مخالف قوتوں کو بار بار چیلنج کیا ہے۔انہوں نے ایوب خان کے کبھی قدم جمنے دیئے ہیں اور نہ ہی یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق کے،انہوں نے ہمیشہ ان کیخلاف آواز اٹھائی ہے اور قائد کا بنیادی پیغام اپنی جانوں کی قربانیوں سے یاد کروادیا ہے۔ یہ کیا ثابت کرتا ہے؟ یہ؟ ثابت کرتا ہے کہ ان کوتاہ اندیشوں کی وجہ سے خواب بے تعبیر ضرور ہوا مگر بدتعبیر نہیں ہوا۔مشرقی پاکستان مغربی بازو سے علیحدہ ہو کر بھی بھارت کا حصہ نہیں بنا،حتیٰ کہ وہ بنگالی زبانی کی بنیاد پر مغربی بنگال کے ساتھ بھی نہیں ملتا۔اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود وطنیت کی بنیاد زبان یا زمین نہیں بنتی،وہ بنیاد ملت رسولِ ہاشمی ﷺ کا ابدی پیغام اسلام ہی رہتا ہے کہ وہ اپنی ترکیب میں خاص ہے۔ چند سالوں بعد وہ بنگلہ دیش باقاعدہ دستوری طور پر اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش بن جاتا ہے۔

یہی صورتحال مغربی بازو کی ہے کہ جنرل ایوب خان دستور سے لفظ اسلامی نکال دیتا ہے مگر اسے پھر واپس لانا پڑتا ہے۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو بھی مسلم قومیت

کی بنیادوں سے پرے ہٹ کر اسلامی کے بجائے مغربی بازو پاکستان کو سوشلسٹ کہنا چاہتا ہے مگر خلقِ خدا کے خوف سے کہہ نہیں سکتا۔ یہ کیا ثابت کرتا ہے؟ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان اندھے فوجی اور سویلین آمروں کے خوفناک ڈنڈے اور جہالت کے باوجود قائداعظم محمد علی جناحؒ ملت اسلامیہ کا ایک بہت ہی عظیم راہنما تھا بلکہ بیسویں صدی کے تناظر میں وہ اس صدی کا سب سے بڑا انسان تھا، کہ کسی اور کے نصیب میں یہ اعزاز نہیں تھا کہ وہ ایک نئی قوم بھی تشکیل دے اور ایک نئی مملکت بھی بنائے۔ وہ واقعی منفرد و ممتاز تھا اور ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں ان جیسا راہنما ملا۔ بقول محمود علی صاحب بنگلہ دیش کے اسلامی کہلوانے کے بعد اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک قوم (مسلمان) اور دو مملکتیں یعنی پاکستان اور بنگلہ دیش اور ڈاکٹر صوفی صاحب کارکن تحریک پاکستان کے بقول کہ مغربی بازو بھی ہمارا وطن ہے اور مشرقی بازو بھی اور ہم سب کا ایک ہی قائد ہے اور وہ ہے قائداعظم محمد علی جناحؒ کہ اس کے دونوں بیٹوں نے اپنے نام ذرا مختلف رکھ لیے ہیں۔ کل کو کشمیر بھی ضرور آزاد ہوگا۔ اول تو وہ پاکستان کیساتھ ملے گا لیکن اگر بھارت سے آزاد بھی ہو جائے تو وہ بھی ہمارا اسلامی بھائی ہوگا۔ محمود علی صاحب اسوقت شاید کہیں کہ ایک قوم تین مملکتیں۔ ویسے تو چوہدری رحمت علی صاحب خالق اسم پاکستان برصغیر میں دس اسلامی مملکتوں کا ذکر کر گئے ہیں کہ موپلستان اور عثمانستان بھی ہونگے۔ وہ صورت ہوگی یا نہیں ہوگی، مگر دین اسلام کے اینٹ گارے سے اٹھی ملت رسول ہاشمی ﷺ اور تین مملکتیں تو صاف نظر آ رہی ہیں۔

اس عظیم قائد کے طفیل یورپ کے دل کے اندر سے بوسینا اور کوسوو بقول ایس ایم ظفر صاحب یورپی پاکستان بن کر ابھرے ہیں کہ اس نظریہ کی بنیاد بھی

قائداعظم محمد علی جناحؒ کا دوقومی نظریہ ہے۔اس نظریہ کی بنیاد پر وسط ایشیا کی پانچ مسلمان جمہوریتیں پہلے ہی آزاد ہو چکی ہیں۔قائد واقعی عظیم تھا، عظیم ہے اور عظیم رہے گا۔وہ اکیسویں صدی میں بھی ہماری رہنمائی فرماتے رہینگے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ہم انشاء اللہ واپس ان کی بتائی راہِ جمہوریت اور وحدت ملی کی طرف لوٹ جائینگے۔آمریت کے حرام خنزیر کو کبھی حلال نہیں کہیں گے اور ہم سب توبہ تائب اور سجدۂ سہو بجالا کر قائد کے نظریاتی پاکستان کو اک ولولہ تازہ دینگے۔اسے اک درخشندہ ستارہ بنائیں گے کہ اس کی روش روش روشن وتاباں ہو کر سب کیلئے مشعلِ راہ ہوگی۔

انشاء اللہ۔

قائداعظمؒ زندہ باد .... پاکستان پائندہ باد !